

طورخم سے کوہ قاف میں

روشنی کے تقابلیں



تالیف
مولانا امیر حمزہ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

*** توجہ فرمائیں! ***

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب.....

عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔

مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد آپ

لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔

متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹوکاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی

نشر و اشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر

تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشر و اشاعت، کتب کی خرید و فروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

ناشر..... دارالاندلس

قیمت.....



پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

اسلام کی نشر و اشاعت کا عالمی مرکز
دارالاندلس®
۴- لیک روڈ، چوہر جی لاہور، پاکستان

Ph: 92-42-7230549 Fax: 92-42-7242639 www.dar-ul-andlus.com

فہرست

- 13 عرض ناشر ❁
- 15 افغانستان اور روس کا سفر ❁
- 17 طورخم ❁
- جہاد کی باتیں، جہاد کی یادیں
- 18 جلال آباد ❁
- 20 شہداء کی یادیں ❁
- 21 جلال آباد کا محاصرہ اور شیخ جمیل الرحمن ❁
- 22 سوئے کابل ❁
- 23 پل چرخی جیل ❁
- 23 پل چرخی کے ایک قیدی کی داستان ❁
- 25 خاد کے دفتر میں ❁
- 26 پھانسی اور پھر ۲۰ سال قید ❁
- 27 پل چرخی جیل میں ❁

- 27 * جیل میں عیسائیت
- 28 * مجھے سزا دینے والا انسر بھی قیدی بن گیا
- 28 * کاہل شہر میں
- 29 * کاہل کے حالات
- 30 * مہنگائی
- 31 * ایک دلچسپ تاریخی جائزہ، بچہ ستھ کون تھا؟
- 33 * صدارتی محل کے حوالے سے موجودہ یادیں
- 34 * بریگیڈیر عبداللہ سے ملاقات
- 35 * کاہل کے حج کی باتیں
- 36 * غزنی کی جانب
- 37 * فاتح سومنات کے غزنین میں
- 39 * سلطان کے بت شکن جہاد پر اک نظر
- 40 * سلطان سومنات میں
- 41 * سلطان نے جب سومنات کو توڑا
- 42 * سلطان محمود کی قبر پر
- 43 * کشمیر کی یاد
- 44 * غزنی سے واپسی
- 45 * کاہل کے ایئر پورٹ کے وی آئی پی روم میں گلم جم کے جرنیلوں کے ساتھ ...
- 47 * ہوائی ٹرک میں سفر

روس کے تعاقب میں

- 51 ❁ شاہراہِ سلانگ پر نہر چیچون (دریائے آمو) تک
- 52 ❁ کوہِ سالاگ پر
- 54 ❁ پلِ خری میں
- 55 ❁ قندوز کی جانب
- 56 ❁ سرسبز و شاداب جنگل میں
- 57 ❁ حضرت حسینؑ کے مزار پر
- 59 ❁ ننگے باجے کی درگاہ پر
- 61 ❁ دشتِ ارچی کی طرف کوچ
- 62 ❁ روسِ افغانستان سے کیوں بھاگا؟ ایک سبب
- 64 ❁ قومندانِ جلات خان کے مہمان
- 65 ❁ گدھے پر سفر
- 67 ❁ سلفی مجاہد مولانا عزیز اللہ شہید کی قبرِ ارگاہ پر
- 70 ❁ قندوز کے سب سے بڑے کمانڈر سے ملاقات
- 71 ❁ دریائے آمو کے کنارے بندر شیرخان میں

روس کی سیر

- 74 ❁ افغانستان سے ترکستان تک روس کے تعاقب میں
- 75 ❁ ماسکو کا سفر
- 77 ❁ ماسکو میں

- 78 ❁ ماسکو کی جامع مسجد کے خطیب سے ملاقات
- 80 ❁ کریملن کی سیر اور ریڈ سکوئر میں لینن کی لاش
- 83 ❁ شیطانی مذہب اور سٹالن کا انجام
- 86 ❁ ڈالر پری کو پکڑنے کی دوڑ
- 88 ❁ ماسکو میں میٹرو

قازان سے آسٹراخان تک

- 90 ❁ دریائے وولگا کے کنارے کنارے
- 91 ❁ تاتارستان کی تاریخی سیر
- 92 ❁ شاہ بلطوار کا ایمان افروز واقعہ
- 93 ❁ قازان میں
- 95 ❁ دریائے وولگا کی لہروں پر بحری جہاز میں
- 96 ❁ لینن کے شہر میں
- 97 ❁ کوپشیب شہر
- 98 ❁ تفریح کے شیطانی مناظر اور ہم
- 100 ❁ ”سرائے“ جو اب ”سارا توف“ ہے
- 101 ❁ وولگا گراڈ
- 102 ❁ آسٹراخان
- 104 ❁ مسجد میں مولویوں کی تصاویر
- 105 ❁ روسی نو مسلم عبدالفتاح سے ملاقات

کوہ قاف کی امام شام کے دیس داغستان میں

- 108 ❁ چوچینیا میں چودہ گھنٹے
- 110 ❁ داغستان
- 111 ❁ مدرسہ الحکمہ میں استاد اور شاگردوں سے ملاقات
- 112 ❁ آذربائیجان میں دل آزار لہجات

قازقستان، ترکمانستان، بخارا اور سمرقند کی قلم بندیا دیں

- 115 ❁ قازقستان
- 116 ❁ جب ہم ”بی نیو“ میں امام مسجد کے مہمان بنے
- 119 ❁ ترکمانستان میں
- 120 ❁ امام بخاری کے شہر میں
- 121 ❁ جامع مسجد امام بخاری میں
- 122 ❁ امام بخاری کی جلا وطنی کے بعد بخارا پر اب تک کیا بتی؟
- 124 ❁ مدرسہ میر عرب
- 126 ❁ سمرقند میں امام بخاری کی قبر پر
- 126 ❁ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور نواز شریف
- 128 ❁ امیر تیمور کے مقبرے پر
- 129 ❁ امیر تیمور کے مقبرے پر (علی ججویری کا) دربار یاد آ گیا
- 130 ❁ تاشقند میں
- 132 ❁ تاشقند کا مدرسہ قوتقداش

- 133 ❁ مصحف عثمان بن عفان کی زیارت اور علم کے موتیوں کا گھر
- 135 ❁ شیخ تاجی اور ان کی تفسیر
- 136 ❁ تازقستان میں دعوتی سرگرمیاں
- 137 ❁ شادی اور تبلیغ
- 139 ❁ شادی پر جلسہ
- 139 ❁ تاشقند کی ایک مسجد میں اہل توحید نوجوانوں کے درمیان
- 142 ❁ ایک دیہاتی عورت ”دیہاتن“ کا قصہ
- 144 ❁ حقیقت اور بے عملی
- 146 ❁ یہودیوں کے عبادت خانے میں
- 148 ❁ وادی فرغانہ
- 150 ❁ دین کی جان شہر اندجان
- 153 ❁ نمزگان
- 153 ❁ نمزگان میں دعوت و تبلیغ
- 154 ❁ دوبارہ تاشقند میں
- 156 ❁ وطن واپسی اور تاشقند میں فوٹو سٹیٹ مشین کا نہ ملنا



اوراب دلی کے تعاقب میں (ان شاء اللہ)

افغانستان سے جب روہی بھاگا تو میں نے طورخم سے دریائے آمو تک افغانستان دیکھا..... تب جہاد کی برکتوں کو..... اسلام اور مجاہدین کی عزتوں کی شکل میں جس انداز سے ہم نے دیکھا..... اور پھر وہ ایسا بھاگا کہ وسط ایشیا کی پانچ ریاستوں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا..... میں اس کے پیچھے گیا اور تاریخ کے اس اہم ترین موقع پر روہی کی ذلتوں اور مجاہدین کی عظمتوں کو تاریخ میں محفوظ کر دیا..... میں ماسکو بھی گیا اور چیچنیا سے آگے تک گیا ہر سو اسلام کی عظمتوں کو دیکھا؟

یہ سارے نظارے آج بھی مجاہدین کو کولرنا زہہ دیتے ہیں..... کہ جب تک جہاد جاری ہے..... اور جہاد قیامت تک جاری رہے گا..... کسجر اور نکسن جو امریکہ کے بڑے مددبر تھے دولوں مرچکے..... انہوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو پھر ایک لمبی سازش تیار کر کے مجاہدین کو باہم لڑایا۔ کہیں مجاہد لیڈروں کو مروا لیا۔ روہی کے ساتھ ایسا کر کے مجاہدین کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی..... اس نے جہاد کے ثمرات کو ضائع کرنے کے لیے پیسہ پائی کی طرح بہایا۔

کشمیر میں جہاد کا جو فیصلہ کن موڑ آچکا ہے اب کیا ہم نے افغانستان کے واقعات سے سبق لیتے ہوئے دہلی سے آگے تک جانا ہے؟..... یا کہ کشمیر تک ہی محدود رہنا ہے۔ عزتوں کا سفر اختیار کرنا ہے یا کہ ذلتوں کی گہرائیوں میں گرنا ہے۔ یہ دولوں اور ان کے راستے آج ہمارے سامنے واضح ہیں۔

زیر نظر سفر نامہ "روہی کے تعاقب میں" جو مشاہدات پر مشتمل ہے..... یہ مشاہدات درس دے رہے ہیں کہ اے مجاہدین کشمیر دلی کے تعاقب کا جب مرحلہ آئے تو دیر نہ کرنا اور پھر وہ ساری برکات حاصل کرنا جن کی ایک جھلک آپ "روہی کے تعاقب میں" دیکھ سکتے ہیں۔

امیر حمزہ

عرض ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ
وَ الْمُرْسَلِيْنَ . اَمَّا بَعْدُ ا

”روس کے تعاقب میں“ مولانا امیر حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کا سفر نامہ روس ہے۔ ایک وقت تھا کہ روس دنیا میں سپر پاور تھا، جس طرف قدم اٹھاتا تھا بڑھتا ہی جاتا تھا، روسیوں نے طاقت کے نشہ میں ناصرف مسلمانوں کا قتل عام کیا بلکہ اللہ رب العزت کا بھی انکار کر دیا، ہر مذہب کا انکار کر کے دہریت کا نیا مذہب ایجاد کیا۔ اسی طاقت کے نشہ میں چور جب روس نے پاکستان کے گرم پانیوں پر قبضہ کرنے کے لیے افغانستان پر چڑھائی کی تو افغان بھائیوں نے روس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا پھر افغانیوں کے ساتھ پاکستانی اور دیگر مسلمان ملتے گئے اور روس کی بربادی کا ذریعہ بنتے گئے۔

افغان جہاد کے نتیجے میں جب اللہ تعالیٰ نے روس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور کروڑوں مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام بھی روسی تسلط سے آزاد ہوئے۔ مسجدیں اور مدرسے جو کل شراب خانے اور سینما گھر بنا دیے گئے تھے، دوبارہ سے ”اللہ اکبر“ کی صداؤں سے معمور

ہونے لگے۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے امیر حمزہ ؓ کو توفیق دی اور انہوں نے ”طور خم سے کوہ تاف تک“ کا سفر کیا، جہاد کے ثمرات کا مشاہدہ کیا اور اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا سے کمیوزم کا جنازہ اٹھتے اور اسے دُفن ہوتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ انہوں نے زیر نظر سفر نامہ میں ثمر قندو بخارا کے ماضی و حال پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

جو ”روس کے تعاقب میں“ کے نام سے شائع ہوا، اب اسے نئی تزئین و آرائش کے ساتھ ”دارالاندلس“ کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جہاد کی برکات سے ایسے ہی سپر طاقتیں بکھرتی اور اسلام غالب آتا ہے۔ اللہ سمجھ عطا فرمائے۔ آمین!

محمد سیف اللہ

مدیر ”دارالاندلس“

۸ رجب ۱۴۲۵ھ



افغانستان اور روس کا سفر

ایک تاریخی یادگار..... اسلامی عظمت کا لازوال نشان

قارئین کرام! میں نے افغانستان کا سفر ”طورخم سے دریائے آموتک“ اس وقت کیا جب روسی نکل کر بھاگے ہی تھے اور مجاہدین نے کنٹرول سنبھالا ہی تھا اور روس کا سفر بھی اس کے بعد فوراً کیا کہ جب وسط ایشیا کی پانچ ریاستیں ازبکستان، تاجکستان، تازکستان، ترکمانستان اور کرغزستان آزاد ہوئیں۔ مجھے اول لڈکر چار ریاستوں میں جانے کا اتفاق ہوا، پھر ماسکو تک گیا، ماسکو کے بعد ”تازان سے آسٹراخان“ تک ”تاتارستان“ کو دیکھا اور پھر ”کوہ تاف“ کے علاقوں چیچنیا، داغستان اور آذربائیجان تک گھوما، دریائے وولگا میں پانچ دن کا بحری سفر بھی کیا اور بحر قزوین کے کنارے پر بھی گھوما۔ ان دنوں روس افغان جہاد کی برکت سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا، میں نے ان برکتوں کو جس طرح سے ان تمام علاقوں میں دیکھا وہ سب اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔

اس دوران میں نے جو محسوس کیا، سچی بات یہ ہے کہ اگر افغان مجاہدین افغانستان کی فتح کے بعد دریائے آموپا رکرتے اور دنیا بھر کے مسلمان مجاہدین کہ جو افغانستان میں موجود تھے، وہ بھی ان کے ہم رکاب ہوتے تو وہ وقت قریب ہوتا جب یہ ماسکو کے کریملس میں ”لینن“ کی لاش کے لکڑے کرتے، مگر یہ جہاد چھوڑ بیٹھے اور آپس میں ہی گھٹم گھٹا ہو گئے، تاہم اس سب کے باوجود آپ میرے ساتھ ساتھ چلیے!

آپ دیکھیں گے کہ جہاد نے کس طرح مسلمانوں کو عزت سے ہمکنار کیا اور یہ کہ اگر ہم اسی طرح اسلام کا غلبہ اور اس کے ماننے والوں کو عزت و عظمت سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ جس کی طرف اللہ کے رسول ﷺ نے چل کر دکھایا اور آج افغانستان میں ہم نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا اور اس خوبصورت تجربے کا نام، جی ہاں! جہاد ہے اور اس قتال کہتے ہیں۔

امیر حمزہ

مدیر ہفت روزہ ”غزوہ“



طور خم

پشاور سے ہم جمرو روڈ پر چلے تو تھوڑی دیر بعد ”باب خیبر“ پھر ”لندی کوتل“ اور گھنٹہ بھر سفر کیا ہوگا کہ پاکستان اور افغانستان کی سرحدی چوکی ”طور خم“ پر جا پہنچے۔

”طور خم“ کا پھانگ ہی وہ درہ ہے کہ جو تاریخ میں ”خیبر“ کے نام سے معروف ہے۔ غزنوی، غوری، لودھی اور بابر غرض جو بھی ہندو پر حملہ آور ہوا اسی درے سے ہو کر حملہ آور ہوا۔ مگر تب ہندو رہا کرتے تھے آج اس درے کے پار مسلمانوں کا ملک پاکستان آباد ہے۔ اور روس نے بھی اسی درے سے گزرا چاہا مگر اسے اس درے سے دور ہی روک دیا گیا حتیٰ کہ وہ یہاں سے بھاگ اٹھا۔ اور آج اس درے پر طور خم کی اس چوکی پر پاکستانی اور افغانی ادھر ادھر آ جا رہے ہیں، نہ کوئی ویزا ہے نہ پاسپورٹ، بس ایک ہی نشان ہے، ایک ہی پہچان ہے اور اس کا نام اسلام ہے۔ یہ تبدیلی، یہ بھائی چارہ، یہ اخوت و محبت ہجرت و جہاد کی برکت سے ہے۔ بارہ سالہ جہاد نے مصنوعی لکیر کو خوب بے اثر کیا ہے۔ کاش! پوری دنیا کے مسلمان ملکوں میں یہ مصنوعی لکیریں مٹ جائیں اور یہ ایک امت عقیدہ اور عمل میں عملی طور پر ”امت واحدہ“ کا نقشہ پیش کرے۔

”طور خم“ سے تقریباً نصف گھنٹے کے بعد افغانستان کا خوبصورت اور میدانی باغ ”شمرخیل“ آ گیا ہے، یہ زیتون کے باغات ہیں، انہی باغات میں واقع ”معسکریطیبہ“ میں کچھ عرصہ کے لیے جہاد کی تربیت دی جاتی رہی۔ اس باغ کا نظارہ کرتے اب ہم آگے بڑھ چکے تھے۔

جہاد کی باتیں، جہاد کی یادیں

جلال آباد:

سات مئی کو میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ پشاور سے جلال آباد پہنچا۔ جلال آباد افغانستان کے صوبہ ننگر ہار کا دار الحکومت ہے اور پشاور سے ۴۷۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم اس شہر میں سب سے پہلے اس شاعری مسجد میں گئے کہ جو دو تین روز قبل تک سیل بند تھی مگر اب اس کے دروازے کھل چکے تھے، لینن و مارکس کی کتابوں کی بجائے اب اس میں سعودی عرب کے چھپے ہوئے قرآن مجید موجود تھے۔

جلال آباد شہر کی وہ سڑک کہ جو طورخم کے راستے پشاور کو جاتی ہے، اس پر عبدالوہابی خان کے باپ عبدالغفار خان کا مقبرہ ہے، باچا خان نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ مجھے غلام ملک میں دفن نہ کیا جائے، آزاد ملک میں دفن کیا جائے، یعنی اس کی نظر میں پاکستان غلام تھا، اس لیے کہ اس پر کمیونسٹوں کا دشمن ضیاء الحق حکمران تھا اور افغانستان آزاد تھا، اس لیے کہ اس ملک میں روسی درندے افغان مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے..... بہر حال عبدالغفار خان کے آزاد ملک میں اسے دفن کر دیا گیا..... مگر آج عبدالوہابی کے باپ باچا خان کے بقول یہ ملک بھی پاکستان کی طرح غلام بن گیا ہے اس لیے کہ ضیاء الحق کے ساتھی آج وہاں فاتحانہ داخل ہوئے ہیں۔ لہذا میں نے دیکھا کہ بڑے خان عبدالغفار خان کا مقبرہ غلام بن چکا تھا، میں جب وہاں گیا تو وہ سیل بند تھا، محافظ موجود تھے، اندر کسی کو جانے نہ دیتے تھے۔ ہم نے پوچھا بھئی کیوں نہیں جانے دیتے تو وہ محافظ کہنے لگے اس لیے کہ کوئی بم دھماکا کر کے باچا

خان کے مقبرے کو اڑانہ دے۔ میرے ہم سفر ساتھی ابو شرجیل نے کہا یہ تو پاکستان کے ایک رسالے کے ایڈیٹر ہیں انھیں تو اندر جانے دیں۔ بہر حال اس کے باوجود بھی بڑی مشکل سے مانے اور ہمارے لیے انھوں نے مقبرے کا قفل کھولا۔ باچا خان نہ سن سکتے تھے نہ میں انھیں سنا سکتا تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ہمیں باخبر کرتے ہیں:

وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ ﴿٦٢﴾

(فاہر: ۶۲)

”اور آپ قبروں میں پڑے لوگوں کو نہیں سنا سکتے۔“

وگر نہ دل تو چاہتا تھا کہ باچا خان کو سناؤں کہ خان صاحب! افغانستان تو غلام بن گیا ہے اب کیا پروگرام ہے؟ یہیں رہنے کا ارادہ ہے یا کہ کہیں اور جانے کا پروگرام ہے؟ بہر حال باچا خان کو تو ہم کہنے سے رہے ان کے فرزند ارجمند خان عبدالولی خان کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب باچا خان جیسے آزاد انسان کو غلام ملک افغانستان میں نہیں رہنے دینا چاہیے، کسی آزاد ملک میں منتقل کرنے کا پروگرام بنانا چاہیے، مگر یہ مشورہ دیتے ہوئے ہمیں یہ خدشہ بھی ہے کہ اگر پاکستان کے ایک اور پڑوسی آزاد ملک بھارت میں خان صاحب کا مقبرہ بنایا گیا تو افغانستان والا عمل تو اب کشمیر میں بھی جاری ہے تو کل کو ہندوستان بھی غلام ہو جائے گا تو پھر باچا خان کو کہاں لے جایا جائے گا؟

بہر حال خان عبدالولی خان آج کل افغانستان کے غلام بننے کے بعد باچا خان کے بارے میں سخت پریشان ہیں اور وہ اس پریشانی کا اظہار انغان مجاہدین کو گالیاں دے کر کر رہے ہیں۔

خان صاحب کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ مجاہدین کو گالیاں دینے سے پریشانی دور نہیں ہوگی بلکہ اس کے لیے اگر کسی دربار کے گدی نشین سے رابطہ کر لیا جائے تو آپ کی پریشانی دور ہو سکتی ہے، کوئی خانقاہی پیر یہ مشورہ دے سکتا ہے کہ خان صاحب ایک بیان اس طرح کا دے دیں کہ باچا خان جو کہ آخر عمر میں ولایت کی بلند و بالا منزلوں پر پہنچ گئے تھے، انھوں نے ہمیں خواب میں بتلایا ہے کہ میں نے افغانستان کی غلامی کے بعد جلال آباد سے ہجرت کر لی ہے اور

میں آزاد ہندوستان کے فلاں شہر کے فلاں مقام پر راتوں رات پہنچ گیا ہوں، لہذا وہاں میرا مقبرہ تعمیر کر دو..... ہمارا خیال ہے کہ اس طرح شاید ولی خان بھی پریشانی سے بچ جائیں اور مجاہدین کو بھی کمیونسٹ دور کی ایک تلخی یاد سے نجات مل جائے اور پھر جب کل کو انڈیا بھی غلام بن جائے تو اسی ولایتی طریقے سے خان صاحب اور آگے اور پھر اس سے بھی آگے سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔

شہداء کی یادیں:

خان عبد الولی خان صاحب کے بارے میں مجلۃ الدعوة کے ذریعے مشوروں کی یہ لڑی ذہن میں پرونے اور ان تک پہنچانے کے بعد ہم کابل کی طرف سے آنے والے اور جلال آباد کے پہلو سے ہو کر کنڑ کو چلے جانے والے دریا پر بنے ہوئے ”بسود پل“ کی طرف چلے گئے، جب مجاہدین نے جلال آباد کا محاصرہ کیا تھا اور اس محاصرے کے لیے جن پہاڑوں پر مورچے بنائے تھے، وہ پہاڑ اب ہمارے سامنے تھے، یہ سامنے گھمبیری کے پہاڑ ہیں۔ یہاں کمیونسٹوں کی ایک پوسٹ تھی جس کا نام مجاہدین نے عورت پوسٹ اس لیے رکھا تھا کہ یہاں عورتیں لڑتی تھیں اور یہ ان ملحدوں کی شیطان پوسٹ تھی۔ اس طرف کو کامہ پل ہے، یہ قادیہ ہے، اس مورچے کا نام حطین ہے۔ یہ مجاہدین کے رکھے ہوئے نام تھے اور یہی وہ پہاڑ اور مورچے تھے جہاں نذیر ابو بکر شہید ہوا، جہاں خالد سیف شہید ہوئے، مولانا قاری عبد الحنیف فیصل آبادی کے صاحبزادے ضیاء الحنیف شہید ہوئے، غرض ان پہاڑوں کو سامنے دیکھتے ہوئے ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے پل سے پار ان پہاڑوں کے دامن میں ایک افغان بھی آگیا، پانی پیا اور پھر جہاد کی باتیں شروع ہو گئیں۔ بوڑھا افغان کہنے لگا میں ہجرت نہیں کر سکا، ہم یہیں بیٹھے رہے، مجاہدین کے کولے ہمارے اوپر سے گزر کر جلال آباد میں گرتے اور کمیونسٹوں کے کولے بھی ہمارے اوپر سے گزر کر ان پہاڑوں پر گرتے۔ عربوں کے بارے میں وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہنے لگا کہ روسی اور افغانی کمیونسٹ ان سے بہت ڈرتے تھے اور عرب اس قدر دلیر تھے کہ وہ بسا اوقات پہاڑوں سے اتر کر یہاں ہمارے گھر

کے قریب آجاتے، میں نے کئی دفعہ انھیں کھانا کھلایا۔

جلال آباد کا محاصرہ اور شیخ جمیل الرحمن:

میرا ہم سفر ساتھی مجھے جلال آباد کے حوالے سے امارت اسلامی کنٹر کے بانی شیخ جمیل الرحمن شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہونے والی ایک نشست کی روداد سنانے لگا کہ جب جلال آباد کے محاصرے کو دو سال کا عرصہ ہونے کو آیا، محاصرہ طویل ہو گیا تو ایک روز چند عرب ساتھیوں نے مجھے بھی ساتھ لیا اور باجوڑ ایجنسی پاکستان میں شیخ جمیل الرحمن شہید سے ملاقات کے لیے چلے گئے۔ ہر مجاہد اس طویل محاصرے پر بڑا ابرہم تھا اور وہ چاہتا تھا کہ شیخ سے بھرپور حملے کی اجازت ملنی چاہیے۔ بہر حال شیخ نے ہر مجاہد کی بات سنی، جب سب مجاہد اپنی اپنی بات تفصیل سے سنا چکے تو شیخ نے کہا اصل بات یہ ہے کہ ہمارا مقصد محض علاقے فتح کرنا نہیں بلکہ جس علاقے کو فتح کیا جاتا ہے ہماری شرعی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ ہم مفتوحہ علاقے میں اللہ کے قانون کا نفاذ کریں، وہاں کے لوگوں کے مسائل اور مصائب کا مداوا کریں۔ اگر ہم یہ کام کر سکیں تو ٹھیک مگر نہ جو علاقے ہمارے پاس پہلے موجود ہیں وہاں ہمیں اپنی شرعی ذمہ داریاں بخوبی نبھانے کے بعد آگے بڑھنا ہوگا اور انہوں نے یاد دلایا کہ دشمن کے محاصرے میں بیٹھے رہنا بھی تو جہاد ہی ہے۔ غرض شیخ کی یہ بصیرت افروز گفتگو سن کر سب مجاہد مطمئن ہو گئے اور آج جلال آباد کی فتح کے بعد شیخ کی یہ بصیرت عملی طور پر سامنے دکھائی دے رہی تھی کہ تمام بڑے شہروں کے طویل محاصروں نے ہی بالآخر کمیونسٹوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔

جلال آباد میں شاہی باغ کی سیر کو اٹھنے تو سامنے غازی امان اللہ کا باغ تھا، اسی میں ان کے والد امیر حبیب اللہ خان کی قبر ہے، جنہوں نے افغانستان پر ۱۹۱۹ء سے تک حکمرانی کی، اپنے باپ کے ساتھ دفن ہیں اور ساتھ ہی امان اللہ کی بیوی ملکہ ثریا کی قبر ہے۔ یہاں سے ہو کر ہم جلال آباد کے مرکزی بازار میں رات گزارنے کے لیے مسافر خانے کی تلاش میں تھے کہ ایک مجاہد نے پہچان لیا اور پھر وہ یہیں ایک گھر میں لے گیا جو کسی کمیونسٹ کی کوٹھی تھی۔ رات ہم نے یہاں گزار لی اور صبح سویرے کابل کی طرف چل دیے۔

سوئے کابل:

جلال آباد سے ہماری بس سات بجے روانہ ہوئی، تقریباً پانچ چھ کلومیٹر تک یعنی دریائے کابل پر بنے ہوئے ڈیم تک وادی کھلی اور شاداب ہے، گھنے درختوں میں کچھ لوگ بھی دکھائی دیے مگر اس کے بعد کابل کے ضلعی صدر مقام سروبی تک ہمیں بیسیوں بستیوں میں ایک بستی بھی ایسی دکھائی نہیں دی جس کا کوئی ایک گھر بھی محفوظ ہو جبکہ سڑک کے کئی پل ٹوٹے ہوئے اور سڑک اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی کہ کابل تک چھ گھنٹوں میں ہڈی پھلی ایک ہوگئی اور پھر جو روسی بربادی کے نشانات تھے وہ دریائے کابل کے ساحل، سڑک کے کنارے اور پہاڑوں کے دامن میں اس قدر زیادہ تھے کہ جلال آباد سے کابل تک وہ جہاں مجاہدین کی عظمت اور قربانیوں کی یاد دلاتے ہیں وہاں وہ روسی تباہی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، جیپیں اور بڑے روسی ٹرک اس تعداد میں تباہ و برباد بکھرے پڑے ہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں میں اگر شمار کریں تو میرے خیال میں مبالغہ نہ ہوگا۔ بڑی گاڑیوں اور جیپوں کا حال تو یہ ہے جیسے کسی نے کھلونوں کو ہاتھ سے توڑ مروڑ کر اور آگ میں جھلسا کر پھینک دیا ہو، یہ سکرپ جو ٹنوں کے حساب سے یہاں پڑا ہے اس میں نہ جانے کتنا اٹھایا گیا، کتنا دریا کی نذر ہو گیا اور جو دکھائی دیتا ہے اس کا بھی شمار نہیں، ٹینک کہیں اوندھے منہ دریا کے کنارے پڑے ہیں، کہیں بکتر بند گاڑیاں چرڑ مرڑ ہو کر سپر پاور روس کے چرڑ مرڑ ہونے کی داستان سناتی ہیں۔

جب سروبی شہر آیا تو مجھے مرکز الدعوة والا رشاد کا مجاہد ساتھی عبدالرؤف شدت سے یاد آیا کہ جو اس شہر کے قریب دریائے کابل کے کنارے شہید ہوا تھا، آج کابل کے دروازے مجاہدین پر کھلے ہیں، فتح نے ان کے قدم چومے ہیں اور ہم آج کابل کی طرف جا رہے تھے تو اس میں جہاں دیگر بے شمار شہداء کا خون شامل ہے وہیں عبدالرؤف کا خون بھی شامل ہے جو سڑک سے ہٹ کر دشوار گزار پہاڑ اور وادیاں عبور کر کے کابل پر حملہ کرنے یہاں تک آیا تھا۔ اللہ اس کی شہادت کو قبول فرمائے کہ وہ شیخ الحدیث عبدالرشید ہزاروی کا فرزند ارجمند اور

ایک نوجوان عالم دین تھا۔

پل چرخی جیل:

اب ہمارے سامنے پل چرخی جیل تھی، یہ کابل سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، افغانستان کی یہ سب سے بڑی اور قیدیوں پر تشدد کے لیے معروف اور انتہائی بدنام جیل ہے۔ مگر اب یہ خالی ہو چکی تھی، اس میں کوئی ایک قیدی بھی نہ تھا، یہاں مجاہدین بھی تھے اور الذوالفقار کے تخریب کاروں سمیت کمیونسٹ بھی۔ الذوالفقار کے وہ پاکستانی نوجوان تھے کہ جنہیں ضیاء حکومت کے خلاف کارروائیوں کے لیے یہاں لایا گیا اور ٹریننگ دی گئی پھر انہیں پاکستان میں بم دھماکے کرنے کو کہا گیا تو جنہوں نے انکار کیا انہیں اس جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اسی طرح افغانستان میں کمیونسٹوں کی دو پارٹیاں تھیں خلق اور پرچم۔ ان میں سے ایک پارٹی اقتدار میں آتی تو دوسری پارٹی کے لوگوں کو جیل میں ڈال دیتی۔ اس جیل میں ظلم و ستم کے ایسے ایسے عجیب و غریب طریقے اختیار کیے جاتے تھے جن سے گزرنے کے بعد کئی لوگ مر جاتے اور جو باقی بچتے وہ حواس کھو بیٹھتے تھے۔ اس قید سے جو رہا ہوئے ہیں ہر ایک کی ایک الگ داستان ہے جو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ تاہم یہاں صرف ایک عرب قیدی ابو جہاد کی داستان ہم آپ کو سنائے دیتے ہیں۔

پل چرخی کے ایک قیدی کی داستان:

ہم جلال آباد میں مصروف جہاد تھے، ہمیں خبر ملی کہ دشمن نے ایک بڑی تیاری کے ساتھ عرب بھائیوں کے مورچوں پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ چنانچہ صبح ہوتے ہی ہوائی جہازوں نے ہمارے مورچوں پر شدید بمباری شروع کر دی، اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ ٹینکوں کی بہت بڑی تعداد ہماری طرف بڑھ رہی ہے، ہم نے اپنا دفاع اور دشمن کو روکنے کا پروگرام بنایا مگر ٹینکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اس حملے کو روکنے کے لیے خط اول پر ہمارے پاس بھاری اسلحہ کم تھا تو امیر جہاد نے ہمیں جبل قبا کے پیچھے چلے جانے کو کہا۔ چنانچہ

ایک گروپ دشمن سے مزاحم ہوتا رہا جبکہ باقی گروپ بحفاظت محفوظ جگہ چلے گئے۔ اب آخر میں ہمارا گروپ تھا جسے محفوظ جگہ پہنچنا تھا، اوپر سے ہم پر جہازوں کی بے پناہ بمباری تھی اور سامنے دشمن سر پر چڑھا ہوا تھا اور اسلحہ ہمارے پاس کم تھا، میں اب بہت زیادہ تھک بھی چکا تھا، چنانچہ میں نے اپنا کچھ اسلحہ اپنے ایک ساتھی کو دے دیا۔ ہمارے پاس صرف ہلکا اسلحہ باقی تھا، ٹینک شکن نہ تھا، چنانچہ میں بوجھ سے ذرا ہلکا ہو کر واپس پلٹنے لگا تو سو میٹر کے فاصلے پر میرے سامنے ایک ٹینک تھا جو تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا، میں دوسری سمت گھوما تو اس جانب بھی ایک ٹینک تھا۔ اب دونوں ٹینک میری طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے اور میرے پاس ٹینکوں کے مقابلے میں اپنے دفاع کے لیے مطلوبہ اسلحہ راکٹ لائٹرز وغیرہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے سمجھ لیا کہ یہ ٹینک مجھے اپنے نیچے کپل کر پریس کر دے گا اور میں نے کلمہ شہادت پڑھ لیا مگر ایک ٹینک میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا، اس سے ایک فوجی باہر نکلا اور اس نے مجھ سے پوچھا کیا تو مجاہد ہے؟ میں نے کہا میں عربی ہوں۔ چنانچہ اس نے دوسرے آدمی کو بھی بلالیا اور انہوں نے مجھے ٹینک کے اندر داخل کر دیا۔

پھر یہ لوگ پہاڑ کی ایک سرنگ میں مجھے لے گئے جہاں جلال آباد میں موجود فوج کے بڑے بڑے آفیسر تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ جسے گرفتار کیا گیا ہے وہ عربی ہے تو وہ سب باری باری مکوں اور گھونسوں اور ٹانگوں کے ساتھ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور ان میں سے ایک کاٹا تھا، وہ تو چیخا ہوا میری آنکھوں کی طرف اس طرح آگے بڑھا کہ وہ میری دونوں آنکھیں نکال لے گا۔ چنانچہ وہ مجھ پر پل پڑا اور میری دونوں آنکھیں نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر قبل اس کے کہ وہ یہ کام کر گزرتا ایک انسرنے آگے بڑھ کر مجھے اس سے چھڑوایا اور پھر انہوں نے مجھے ایک بکتر بند گاڑی میں جلال آباد شہر روانہ کر دیا۔

جب ہم جلال آباد میں پہنچے تو ایک انسرنے مجھے گاڑی سے نکالا اور سڑک کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا دیا اور پھر بلند آواز سے موجود لوگوں کو آواز دی: ”لوگو! دیکھو! یہ عربی وہابی ہے۔“ جو لوگ وہاں موجود تھے بڑی تیزی سے میرے گرد جمع ہونے لگے کہ دیکھیں تو سہی یہ

عجیب مخلوق کون ہے اور پھر ان میں سے ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق مجھے پیٹنے لگا حتیٰ کہ مجھے اپنی موت نظر آنے لگی مگر قبل اس کے کہ میری روح میرے جسم سے جدا ہوتی انہوں نے مجھے ایک کار میں بٹھایا اور جلال آباد ایئر پورٹ پر لے گئے، وہاں ہوائی جہاز کے ذریعے کابل پہنچا دیا۔

خاد کے دفتر میں:

کابل میں مجھے خاد کے دفتر میں لے جایا گیا، وہاں عربی کا ایک مترجم منگولیا گیا اور دس روز تک میری تفتیش کرتے رہے اور پوچھتے رہے کہ کن کے ساتھ تو کام کرتا ہے، یہاں کیوں آیا، افغانستان میں داخل کیسے ہوا، کس ملک کے لیے تو جاسوسی کرتا ہے، افغانستان میں عربوں کی تعداد کتنی ہے، تمہارا امیر کون ہے وغیرہ وغیرہ؟ میں نے انہیں ان کے سوالات کے جوابات دیے مگر کوئی ایسی بات نہ بتلائی جس سے جہاد کو نقصان پہنچے۔ پھر وہ انسر جو کہ میری تحقیق و تفتیش کر رہا تھا مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا اچھا تو پھر تو مجاہد ہے مگر کہاں ہے جہاد؟ اور پھر جلا دوں کو حکم دیا کہ وہ مجھے ماریں، پھر کچھ دن یونہی گزرنے کے بعد دوبارہ مجھے حاضر کیا گیا اور کہا کہ تو نے جو کچھ کہا وہ سب جھوٹ تھا اور پھر طرح طرح کی سزائیں اور ایذائیں پہنچانے کے بعد انہوں نے مجھے صحافیوں کے سامنے پیش کرنے کا پروگرام بنایا۔

ایک انسر میرے پاس آیا اور کہنے لگا صحافیوں کے سامنے پیش ہو جاؤ اور انہیں کہو کہ میں جاسوس ہوں اور میں جمہوری افغانستان کی جاسوسی کرنے کے لیے آیا ہوں اور یہ کہ مجاہدین اس وطن اور اس کی سرزمین کا سودا کرنے والے ہیں اور یہ کہ جہاد کو گالی دو اور مجاہدین پر لعنت کرو۔ چنانچہ میں صحافیوں کے سامنے پیش ہو گیا اور جو اللہ کو منظور تھا وہ میں نے کہا۔

اس کے بعد تیسری مرتبہ انہوں نے مجھے طلب کیا اور بعض ایسے جلا دوں کے سپرد کیا جو بجلی کے جھٹکے اور دیگر طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے۔ اب میں ان کے ہاتھوں میں لاچار اور بے بس ہو چکا تھا، چنانچہ میں نے ان کی ایذاؤں سے بچنے کے لیے کہا کہ مجھے فلاں ملک نے

جاسوسی کے لیے بھیجا ہے وغیرہ وغیرہ..... تو اب وہ مجھے ایک بلڈنگ کے چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے بٹھا دیا اور حج مجھ سے سوالات کرنے لگا تو میں نے ان سب باتوں کا انکار کر دیا جس کا میں نے فوجی انٹرویو کے سامنے اقرار کیا تھا اور کہا کہ یہ دباؤ اور ظلم کی وجہ سے اعتراف تھا۔ اب وہ سب مذاق کرتے ہوئے میری اس بات پر ہنسنے لگے اور کہنے لگے یہ تو تیری ریہرسل تھی کہ بھلا تو اصل عدالت کے سامنے جا کر کیا کہے گا؟

پھر ایک روز انہوں نے مجھے عدالت کے سامنے پیش کر دیا، میں جب کمرے میں داخل ہونے لگا تو وہاں بہت سے لوگوں کا جم غفیر تھا جو ایک وہابی اور عربی کو عدالت میں دیکھنے کے لیے آیا تھا۔

عدالت میں پیش ہوا تو مجھ پر یہ الزامات پڑھ کر سنائے گئے کہ یہ ویزا اور پاسپورٹ کے بغیر افغانستان میں داخل ہوا، یہ تخریب کار گروہ کا ساتھی ہے، یہ بغیر لائسنس کے اسلحہ رکھتا تھا، افغانستان کے امن کو غارت کرنے کے لیے یہ بیرون ملک دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔

میں نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے علمائے سوء دکھائی دیے جو سرکاری اور درباری تھے، انہوں نے بڑے بڑے پگڑ باندھ رکھے تھے اور ان کے ساتھ جاسوسی کا ادارہ ”خاد“ کی نوجوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

میں نے ان الزامات کا جواب دیا اور پھر تاقضی نے مجھ سے پوچھا تم فلسطین میں جہاد کیوں نہیں کرتے؟ میں نے جواب دیا اس لیے کہ افغانستان میں تو جہاد کے مواقع موجود ہیں جبکہ فلسطین میں کہاں؟ اور جب وہاں دروازے کھل جائیں گے تو وہاں بھی کریں گے، مگر ہم افغانستان میں کیوں انتظار کریں کہ اسے بھی گنوا بیٹھیں، جس طرح کہ تاشقند، بخارا اور سمرقند گنوا بیٹھے۔

پھانسی اور پھر ۲۰ سال قید:

اب تاقضی نے فیصلہ سنایا کہ جمہوری افغانستان کے قانون کے مطابق ان جرائم کی سزا پھانسی ہے مگر حکومت افغانستان نے انسانی ہمدردی کی بنا پر اس سزا میں تخفیف کر کے بیس

سال کی سزا سنائی ہے۔

پل چرخی جیل میں:

اب ہمیں پل چرخی جیل میں منتقل کر دیا گیا، یہاں عربی، پاکستانی اور افغان مجاہدین بھی تھے، خلق اور پرچم کے کمیونسٹ بھی تھے، جیل کے داروغوں نے باقی قیدیوں کو ہمارے ساتھ ملنے جلنے سے سختی سے منع کر دیا اور ڈرایا کہ یہ وہابی ہیں جن سے مل کر آدمی کا مذہب خراب ہو جاتا ہے۔

سخیتوں کے ساتھ ساتھ اللہ کا یہ احسان بھی تھا کہ ہمیں بعض لوگ ملنے آتے اور کھانے پینے کی مختلف چیزیں لاتے اور کہتے کہ یہ تمہارے فلاں عرب بھائیوں کی طرف سے ہیں۔ ہم تعجب کرتے کہ یہ لوگ اور یہ چیزیں ہم تک کیسے پہنچ جاتی ہیں اور وہاں سے پہنچ جاتی ہیں جہاں سے ہمارا وہم و گماں تک نہیں ہوتا۔

جیل میں عیسائیت:

جیل میں بین الاقوامی سرخ صلیب کے نمائندے بھی آتے جو مختلف چیزیں دے کر عیسائیت کی طرف راغب کرتے۔ ایسا ہی ایک وفد آیا۔ اس نے ہم سے ملاقات کرنا چاہی تو ہم نے اسے مسترد کر دیا پھر زبردستی ہماری ملاقات کروائی گئی۔ انہوں نے ہم سے کہا آپ کو رسائل اور دیگر جو بھی ضرورت ہے وہ بتلائیے۔ ہم نے کہا ہمیں کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اسی تنظیم کی ایک عیسائی عورت جو ایران سے تعلق رکھتی تھی وہ آئی، وہ اپنے حسن کی شوخیاں دکھلاتی، فارسی میں گانے گاتی اور پھر قیدیوں کے ساتھ نازیبا حرکات کرتی۔

پھر انسانی ہمدردی کے نام پر کچھ دوسرے عیسائی صلیبی آئے، وہ بڑے دلکش اور خوبصورت بیگ تقسیم کرتے رہے جن میں بنیان، افغانی چادریں اور دیگر مختلف چیزیں ہوتیں، جن پر صلیب کے نشان بنے ہوتے تھے۔

جیل میں حکومت کی طرف سے نشہ آور چیزیں بھی دی جاتیں اور اس قسم کے ٹیکے بھی

لگائے جاتے کہ جن سے قیدیوں کو فحاشی پر ابھارا جائے اور ان کے اخلاق کو تباہ کیا جائے۔
مجھے سزا دینے والا افسر بھی قیدی بن گیا:

جنرل شاہنواز تنائی نے جب کابل میں نجیب کے خلاف انقلاب برپا کیا اور وہ ناکام ہو گیا تو اس جیل میں میرے ساتھ وہ جنرل بھی قیدی بن گیا کہ جس نے جلال آباد میں مجھے سڑک پر بٹھا کر تعذیب سے دوچار کیا تھا، اب وہ جیل میں ہمارا ساتھی تھا، اس کے ساتھ دو ہزار مزید فوجی آفیسر تھے جو اس جیل میں لائے گئے۔

ابو جہاد کہ جو اب اس جیل خانے سے آزاد ہو چکے ہیں، انہوں نے اپنی داستان سنانے کے بعد مجاہد ساتھیوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ دنیا بھر میں حق کے لیے جو ہمارے ساتھی جیلوں میں موجود ہیں انہیں اپنی دعاؤں میں نہ بھولیں۔

کابل شہر میں:

۸ مئی کو ایک بے ہم کابل میں دریائے کابل کے کنارے پل ہشتی کے سامنے جامع مسجد کابل پہنچے، خطبہ جمعہ ہو رہا تھا، مجاہدین راکٹ لائچروں، کلاشکونوں اور دیگر اسلحہ سمیت مسجد کے اندر اور باہر مسلح تعینات تھے۔ صبغت اللہ مجددی صدر افغانستان کے یہاں پہنچنے کے بعد آج امن کا پہلا دن تھا اور مجاہدین کی فتح کے بعد پہلا خطبہ جمعہ تھا۔ خطبہ قاری محمد نبی صاحب فارسی میں دے رہے تھے، صبغت اللہ مجددی، احمد شاہ مسعود اور دیگر بڑے بڑے لیڈر مسجد میں موجود تھے۔ امام صاحب کمیونزم کی بربادی اور جہاد کی برکات بیان کر رہے تھے، اسلامی حکومت کے خدوخال سے لیڈروں کو آگاہ کر رہے تھے اور انہوں نے اپنا خطبہ اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان پر ختم کیا:

الْجِهَادُ مَا ضَرَّ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

”جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔“

کابل میں پل ہشتی کی یہ وہی جامع مسجد ہے جس میں جنرل ضیاء الحق نے فتح کے بعد

شکرانے کے دو نفل کی منت مانی ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس روز جنرل ضیاء الحق، جنرل اختر عبدالرحمن، خاص طور پر شیخ جمیل الرحمن بڑی شدت سے یاد آئے کہ آج سارے افغان لیڈر موجود ہیں مگر ہمارا شیخ دکھائی نہیں دیتا، کتڑ بھی جہادۃ الدعوة کو اللہ نے واپس دے دیا مگر شیخ واپس نہیں آسکتے، ہمیں بھی بہر حال اب ان کے پاس جانا ہے۔

مسجد میں مجھے حرکتہ المجاہدین کے رسالہ ”الارشاد“ کے ایڈیٹر عبدالحمید صاحب دکھائی دیے، میں ان سے ملا اور کہا کہ آج کابل پہلی بار آیا ہوں اور ابھی آرہا ہوں، ہمارے قیام کا بندوبست آپ نے کرنا ہے۔ چنانچہ نماز کے بعد وہ ہمیں اپنی جماعت کے سربراہ فضل الرحمن خلیل کے پاس لے گئے اور پھر ہمیں گاڑی میں بٹھا کر شہر کے فائیو سٹار ہوٹل کابل میں لے گئے۔ یہاں اوتاف کے وزیر مولانا ارسلان خان رحمانی سے انہوں نے ہماری ملاقات کر لی اور پھر احمد شاہ مسعود کی شورئی نظار کے وزیر مالیات جناب خالد صاحب سے تعارف کروایا۔ اب ہم کابل ہوٹل میں بیٹھے تھے، عبدالحمید صاحب کے ایک مجاہد ساتھی کہنے لگے آپ کے شیخ سمیع اللہ صاحب بھی کابل میں ہیں۔ میں نے کہا یا! آپ ہمیں ان تک پہنچائیں۔ انہوں نے تھوڑی دیر بعد شیخ کا سراغ لگایا اور ہمیں بتلایا کہ وہ پلازا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہ ساتھی ہمیں پلازا ہوٹل میں چھوڑ آئے۔ شیخ سمیع اللہ صاحب امیر جماعتہ الدعوة یہاں سے واپس پشاور جا چکے تھے جبکہ شیخ جمیل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے شیخ ولی اللہ صاحب یہاں موجود تھے۔ اب ہم ہفتہ بھر کابل میں رہے تو شیخ ولی اللہ کے ساتھ اسی ہوٹل میں رہے۔

ہم سارا دن کابل میں گھومتے اور شام کو ہوٹل میں اکٹھے ہوتے تو ہم اپنے تاثرات بیان کرتے جبکہ ولی اللہ صاحب جو افغان لیڈروں کے ساتھ اعلیٰ سطح کی ملاقاتوں میں مصروف رہتے، ہمیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کرتے۔

کابل کے حالات:

کابل میں مجاہدین کی مختلف تنظیموں کے کمانڈر ٹیموں اور بکتر بند گاڑیوں میں بھاری

اسلمہ سمیت گشت کر رہے تھے، کابل کے مختلف علاقوں میں مختلف تنظیموں کا کنٹرول تھا، گلم جم ملیشیا بھی تھی جو ہوائی اڈے اور دیگر کئی جگہوں پر موجود تھی مگر مجاہدین کے رعب تلے دہلی ہوئی تھی۔ امان اللہ کا محل جو کہ اب احمد شاہ مسعود کا دفتر تھا، اس طرف کو ہم گئے تو کئی جگہ پر شیعہ تنظیم وحدت اسلامی کا کنٹرول تھا۔ ان کے بارے لوگوں نے بتلایا کہ یہ ہزارہ جات کے لوگ ہیں جو کہ چنگیز کی نسل سے ہیں، کمیونسٹوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے، کابل میں موجود تھے۔ چنانچہ کابل میں جب نجیب کے استعفیٰ کے بعد امراتفری کا عالم ہوا تو یہ بھی بعض اہم جگہوں پر کنٹرول حاصل کر کے مجاہد بن بیٹھے ہیں، ان کی لوٹ مار بھی زبان زد عام تھی، شہر سنان معلوم ہوتا تھا، لوگ خوفزدہ تھے، کئی لوگ کابل سے باہر جا رہے تھے، حکمت یار کے حملے کا دھڑکا تھا، ابھی تین روز قبل انہوں نے سامنے والی پہاڑی سے میزائل دانے تھے اور بیسوں لوگ جان دے بیٹھے تھے۔ گلم جم ملیشیا کی لوٹ مار بھی زبان زد عام تھی حتیٰ کہ ہم پلازہ ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ نیچے شور کی آواز آئی، جب ساتھی گئے تو پتا چلا کہ گلم جم والوں نے ایک عورت کا سامان اور عزت لوٹ لی ہے۔

ہمارے ساتھیوں نے ہمیں بھی کہا تھا کہ اس وقت کابل میں گھومنا موت کو دعوت دینے والی بات ہے، کوئی کسی کو پوچھنے والا نہیں، مگر ہم دونوں ساتھی اس کے باوجود دن بھر شہر میں گھومتے اور حالات کا جائزہ لیتے رہتے۔

مہنگائی:

انغان کرنسی کا نام انغانی ہے سو انغانی سکے ساڑھے پانچ روپے پاکستانی کے برابر تھے۔ پاکستانی روپے کو انغانستان میں ”کھلد ار“ کہا جاتا ہے، مالٹا یہاں دس روپے کا تھا اور آم ڈیڑھ ہزار انغانی فی کلو تھے۔ ہم دونوں ایک وقت کھانا کھاتے تو ڈیڑھ ہزار انغانی کے لگ بھگ خرچہ آجاتا۔ ٹیکسی والا بھی تھوڑے سے سفر کے لیے ۸ سو، ہزار اور بارہ صد انغانی سے کم بات نہ کرتا تھا۔ جنگ کی وجہ سے لوگ مہنگائی میں پس چکے تھے، کئی سفید پوش پڑھے لکھے

لوگ اس قدر مجبور تھے کہ ہمیں آکر کہتے ایک وقت کا کھانا ہی کھلا دیں۔ بازار سے چیزیں نایاب تھیں اور جو موجود تھیں وہ آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔

ایک دلچسپ تاریخی جائزہ، بچہ سقہ کون تھا؟:

ایک روز ہم اپنے ہوٹل سے دائیں طرف ایک باغ میں نکل گئے، اس باغ میں امیر عبدالرحمن کی قبر ہے، افغانستان کا یہ وہ بادشاہ ہے جو اپنے آپ کو امیر کہلاتا تھا، اس نے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو افغانستان آنے کی دعوت بھی دی تھی۔

چنانچہ ان تینوں کا سفر نامہ ”سیر افغانستان“ کے نام سے ہماری لائبریریوں میں موجود ہے۔ امان اللہ خان اسی امیر عبدالرحمن کا پوتا تھا جو امیر حبیب اللہ کے بعد افغانستان کا بادشاہ بنا تھا۔ امان اللہ خان کے دور میں انگریزوں نے افغانستان میں قدم جانے کی کوشش کی تو افغانی اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت کی سپر پاور برطانیہ کو افغانستان سے نکال باہر کیا۔ انگریزوں پر فتح کے حوالے سے کابل میں مینار استقلال موجود ہے اور اسی حوالے سے امان اللہ خان کو غازی کہا جاتا ہے۔

ہوا یوں کہ تلوار کے ساتھ انگریز کو شکست سے دوچار کرنے والا امان اللہ خان انگریز کی تہذیبی یلغار کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور اس نے افغانستان کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے افغانستان کو انگریزی تہذیب میں رنگنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے سرکاری اہلکاروں کو تعلیم و تربیت کے لیے یورپ بھیجا اور پھر خود بھی اپنی ملکہ ثریا خانم کے ہمراہ یورپ کے دورے پر جا نکلا۔ وہاں ملکہ نے پردہ نہ کیا اور افغان قوم اس پر بھڑکی کہ یہ ہماری غیرت کا سوال ہے کہ افغانوں کے بادشاہ کی ملکہ عیسائی ملک میں بے پردہ گھومے۔ چنانچہ امان اللہ خان اور آگے بڑھا اور اس نے تمام عورتوں کو بے پردگی کا حکم دے دیا، افغانی برقع کہ جس میں منہ چھپا ہوتا ہے اسے ممنوع قرار دیا اور ایران کا بکتی برقع کہ جس میں چہرہ کھلا رہتا ہے اسے رائج کرنے کا اعلان کیا۔ مزید برآں اس نے ترکی کے کمال اتاترک کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ”یک

زوجگی، یعنی ایک بیوی عی کے رکھنے کا حکم دیا کہ جن سرکاری ملازمین نے ایک سے زائد عورتوں سے شادی کر رکھی ہے وہ یا تو زائد بیویوں کو طلاق دے دیں یا ملازمت چھوڑ دیں۔ اسی طرح اس نے قومی پرچم سے کلمہ طیبہ کو بھی نکال دینے کا حکم دیا۔

ادھر بچہ سقہ جو کہ شمالی علاقے کا ایک نوجوان اور فوج میں سپاہی تھا، وہ ڈاکو بن کر اپنا بہت بڑا گروہ اور فوج بنا چکا تھا، لوگ ڈاکوؤں سے تنگ تھے اور دوسرا یہ کہ بادشاہ کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ وہ ملحد، بے دین اور مرتد ہو گیا ہے۔ چنانچہ بے چینی، افراتفری اور ہر سو بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر بچہ سقہ نے کابل کے قریب قلعہ مراد پر قبضہ کر لیا۔ تو اب امان اللہ خان اپنے بھائی سردار عنایت اللہ کو بادشاہ بنا کر خود قندھار بھاگ گیا۔ اب بچہ سقہ یہاں ٹھہرنے والا کب تھا، اس نے آگے بڑھ کر کابل پر قبضہ کر لیا اور اس کے مؤذن یعنی اعلان کرنے والے کابل میں یہ اعلان کرتے تھے کہ بچہ سقہ دین کی خدمت کے لیے آیا ہے، وہ دین کی حمایت میں کافر بادشاہ سے لڑتا رہا ہے، اس لیے کسی کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، اس نے ظالم کافر سے نجات دلائی ہے، لہذا اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

تاریخ کرام! اس باغ میں سردار عنایت اللہ کی قبر موجود تھی جس کے کتبے پر بچہ سقہ کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ اس ظالم نے سردار عنایت اللہ کا حق بادشاہت غصب کیا۔ بچہ سقہ ڈاکو تھا مگر کابل کے تخت سے اس نے بہر حال ایسے شخص کو بھگایا جو بے دین ہو چکا تھا، جس نے انگریز سے جہاد کیا تو عزت پائی، مغربی تہذیب اپنائی تو ذلت پائی اور بچہ سقہ نے تخت کابل پر براجمان ہو کر جو اعلان کیا وہ کس قدر ایک مسلمان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والا ہے، ملاحظہ کیجیے:-

(۱) امان اللہ خان کے تمام احکامات منسوخ کیے جاتے ہیں۔

(۲) حکومت کی آئندہ اساس شرع محمدی ﷺ پر ہوگی۔

(۳) مکاتب میں تعلیم نسواں بند کی جاتی ہے۔

- (۴) بکتی (ایرانی) برقع سختی سے ممنوع قرار دیا جاتا ہے، کوئی عورت دلاق (انغان) برقع کے بغیر گھر سے باہر نہیں آئے گی۔
- (۵) تمام مردوں کو شرع محمدی ﷺ کے مطابق چار عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے۔
- (۶) جن لوگوں نے امان اللہ خان کے دور میں اپنی ایک سے زائد بیویوں کو چھوڑ دیا تھا انھیں اپنی مطلقہ سے دوبارہ نکاح کرنے کی اجازت ہے۔
- (۷) مالیہ اس سال معاف ہے۔
- (۸) جبری فوجی خدمت موقوف کی جاتی ہے۔
- (۹) ”بادشاہ“ کا جو لقب امان اللہ خان نے اختیار کیا وہ اسلام کے منافی ہے اس لیے افغانستان کا حکمران اپنے نام کے ساتھ ”امیر“ اور ”خادم دین“ کا لقب رکھے گا۔
- (۱۰) جھنڈا بدستور کلمہ طیبہ والا ہوگا اور تعطیل جمعہ کو ہوگی۔

صدارتی محل کے حوالے سے موجودہ یادیں:

ایک روز بطور خاص ہم صدارتی محل میں گئے، کچھ دیر تک وہاں گھومتے رہے، یہ وہی صدارتی محل ہے کہ جہاں ظاہر شاہ کا باپ نادر شاہ بادشاہی کیا کرتا تھا۔ نادر شاہ ایک جلا وطن سپہ سالار تھا جس نے بچہ سقمہ کی نو ماہی حکومت کا تختہ الٹا، اسے قتل کیا اور افغانستان کا بادشاہ بنا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ظاہر شاہ بادشاہ بنا جو روسیوں کا یار، انڈیا کا ساتھی اور پاکستان کا دشمن تھا۔ یہ ۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کا دن تھا جب روس کی شہ پر ظاہر شاہ کے بہنوئی سردار داؤد نے اس کا تختہ الٹ دیا اور وہ روم میں ہی بیٹھا رہ گیا۔

روس اب داؤد سے بھی بڑھ کر روس نواز حکمران چاہتا تھا، چنانچہ اسی صدارتی محل میں ۲۷ اپریل ۱۹۷۳ء کو روس نے افغانستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ذریعہ انقلاب برپا کیا، داؤد کو اہل خانہ سمیت قتل کر دیا گیا، عبدالقادر ڈوگر وال انقلابی تھا، داؤد کی لاش کو اس محل کے سامنے سڑک پر پھینک دیا گیا، راہ گیروں کو حکم دیا جاتا تھا کہ جو بھی یہاں سے گزرے داؤد

کے منہ پر تھو کے اور عبد القادر کی تصویر کے گلے میں ہار ڈالے۔ اب ترہ کئی حکمران بن چکا تھا، پھر وہ قتل ہوا اور حفیظ اللہ امین آیا پھر وہ بھی قتل ہوا اور ہبرک کارمل صدر بنا، اسے معزول کیا گیا تو نجیب صدر بنا، وہ چند دن قبل تک اسی محل میں تھا، اب وہ اقوام متحدہ کے دفتر میں قید تھا اور یہاں مجاہدین کا بسیرا تھا۔

رہے نام اللہ کا، جہاد زندہ باد، مجاہدین زندہ باد کے نعرے اب اس شہر میں گونج رہے تھے، روزانہ شام ہوتے ہی خوشی میں مجاہدین کا شکر و شکرانہ اور ہلکا اسلمہ چلا کر نضا میں تھر تھر اہٹ پیدا کرتے ہیں، رنگین گولیاں لکیریں بناتی ہوئی عجیب منظر پیش کرتی ہیں..... یہ افغانستان کے سب شہروں کا اب معمول بن چکا ہے۔

بریگیڈیر عبداللہ سے ملاقات:

صوبہ کنڑ چونکہ جماعت الدعوة کے کنٹرول میں ہے اس لیے کنڑ سے تعلق رکھنے والے وہ سول اور فوجی آفیسرز اور دوسرے لوگ جو کابل میں کمیونسٹ حکومت میں فرائض سرانجام دیتے تھے، وہ مجاہدین کی حکومت قائم ہونے کے بعد جماعت الدعوة کے راہنماؤں کے پاس آ کر معافی کے خواستگار ہوتے تھے۔ اسی طرح اپنے اپنے علاقوں سے متعلق لوگ وہاں کے کمانڈروں اور جماعتوں کے راہنماؤں سے مل کر وفاداری کا اظہار کر رہے تھے۔

شیخ ولی اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں مجھ سے مشورہ طلب کیا تو میں نے کہا کہ حکومت عام معافی کا اعلان کر چکی ہے اور اب یہ لوگ آپ کے پاس مادم ہو کر آرہے ہیں، آپ بھی انہیں معاف کر دیں، شیخ نے کہا میرا بھی یہی خیال ہے۔

چنانچہ ایک روز بریگیڈیر نے جب یہ دیکھا کہ ہم پاکستانی ہیں تو اس نے سوال کیا کہ کیا آپ بھی ہمارے ساتھ لڑتے رہے ہیں؟ میرے مجاہد ساتھی نے اثبات میں جواب دیا تو بریگیڈیر سب پوچھنے لگا، ہم نے کہا آپ لوگوں نے کمیونسٹوں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں پر ظلم کیا تھا لہذا ہم کیوں نہ لڑتے؟ تب وہ حیرانی سے کہنے لگا کہ پاکستان سے یہاں آ کر آپ کو

ہوائی جہازوں کی بے پناہ بمباری اور دیگر مہلک ہتھیاروں سے ڈرنے لگتا تھا؟ میرے ساتھی نے کہا بریگیڈیر صاحب! ہم اللہ کے فضل سے سخت کولہ باری میں زیادہ خوش ہوتے تھے کہ اس سے شہادت حاصل ہوگی، جو مومن و مجاہد کا مطلوب ہے جبکہ آپ تو ڈرتے تھے اور کیوں نہ ڈرتے کہ آپ کے دل ایمان سے خالی اور لا دینیت سے معمور تھے۔ اب میرے مجاہد ساتھی نے سوال کیا کہ کیا جب روسی آپ کے ملک میں مسلمان بھائیوں پر، آپ کے ہم وطنوں پر ظلم کرتے تھے، قتل عام کرتے تھے تو آپ پر اس کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا تھا؟ اس نے نفی میں جواب دیا تو مجاہد ساتھی نے کہا اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا ضمیر بے غیرت ہو گیا تھا۔ اس پر بریگیڈیر کہنے لگا ہاں! آپ کی بات ٹھیک ہے۔

کابل کے حج کی باتیں:

مولانا عصمت اللہ کنڑ میں درہ مزار نورگل کے رہنے والے ہیں، کابل میں ان کا خالو غلام نبی رہتا ہے وہ انھیں بتلا رہا تھا کہ جب داؤد برسر اقتدار آیا تو مجھے معزول کر کے تین ماہ تک جیل میں بند رکھا گیا، ہر وقت آنکھوں پر پٹی بندھی رہتی جو صرف بیت الخلاء میں جانے اور کھانا کھانے کے وقت کھولی جاتی پھر مجھے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ نجیب کے دور میں سپریم کورٹ کہ جسے ”سترہ محکمہ“ کہا جاتا ہے، اس کے حج کے لیے پیشکش ہوئی، اٹارنی جنرل کی آفر ہوئی مگر قبول نہیں کی۔ حج صاحب جو جامعۃ الازہر مصر کے فارغ ہیں، بتلاتے ہیں کہ کمیونسٹ جب اقتدار میں آئے تو شیعہ، سنی، اہل حدیث سب ان کے ہاں گردن زدنی تھے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ مجاہد زور پکڑ رہے ہیں تو پھر انھوں نے حکمت یا رکو امریکہ نواز قرار دیا، شیخ جمیل الرحمن اور عبدالرب رسول سیاف کو وہابی قرار دیا اور ریڈیو، ٹیلی ویژن پر یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ یہ جنگ وہابیوں اور انغان عوام کے درمیان ہے اور یہ جو اپنے آپ کو مجاہد کہلاتے ہیں یہ عربوں سے پیسے لے کر ان کے غلام بن گئے ہیں اور اپنی ملت کے خلاف لڑتے ہیں مگر یہ عرب وہابی ہم پر حکومت نہیں کر سکتے، نہ ہم انھیں کرنے دیں گے اور پھر

ڈراتے ہوئے کہتے کہ اگر یہ وہابی یہاں آگئے تو تمہیں بھی نہ چھوڑیں گے اور سب افغانوں کو مشرک اور بدعتی قرار دے کر قتل کر دیں گے۔ پھر وہابیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتے کہ یہ اپنی تیسری اور پانچویں اور ساتویں سگی بہن سے نکاح جائز سمجھتے ہیں اور ان کے ہاں سو تیلی ماں سے بھی شادی جائز ہے، تو اس طرح سے وہ نفرت پیدا کرتے تھے۔

غزنی کی جانب:

سلطان محمود غزنوی جو مجاہدین کی آئیڈیل شخصیت ہے، اس کے شہر غزنی کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ چنانچہ ہم دس مئی کو صبح چھ بجے کاہل سے روانہ ہوئے اور پچھلے پہر چار بجے غزنی پہنچے۔ وہ سفر جو روسیوں کے آنے سے پہلے دو گھنٹے کا ہوا کرتا تھا اب وہ سفر دس گھنٹے کا ہو چکا تھا۔ روسی ٹینکوں نے سڑک کو اس قدر برباد کیا ہے کہ اس سفر نے ہماری بڑی پسلی ایک کر دی جبکہ عورتوں اور بچوں کا بس میں اس قدر بحال تھا کہ جو ناقابل بیان ہے۔ راستے میں ایک جگہ بس پنکچر ہو گئی تو افغانی لوگ پہاڑی چارا جو کہ بڑے بڑے پتوں والی سبز بوٹی تھی، اکھاڑ کر کھانے لگے۔ انہوں نے ہمیں بھی دعوت دی، یہ قدرے کڑوے سے پتے تھے جنہیں ہم چکھ کر رک گئے، وہ اس سے اپنی بھوک مٹا رہے تھے۔

اسی طرح افغانستان میں ایک اور انتہائی کھٹی اور بد مزہ سی خود روسی ہے جسے افغان پکا کر اور کچا بھی بہت کھاتے ہیں..... اب بتلائیے! ایسی قوم جو پہاڑوں کی بوٹیاں، پتے اور چشموں کے پانی پر گزارہ کر سکتی ہو، ہتھیار اس کا زیور ہوں، پہاڑ ان کے مسکن اور ڈھالیں ہوں، غیرت و حمیت ان کی گھٹی میں ہو، بھلا وہ کسی کی غلام بن سکتی ہے..... اور جہاد کی کھٹن زندگی میں یہی چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جہادی واقعات ملاحظہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ انہوں نے دنیا کو کیسے فتح کیا تھا۔ ایک صحابی بتلاتے ہیں کہ جہاد کے سفر میں بعض اوقات درختوں کے پتوں پر ہمیں اتنا لمبا عرصہ گزارنا پڑتا کہ ہمیں قضاے حاجت یوں ہوتی جیسے بکری میٹلیاں کرتی ہے۔

فاتح سومنات کے غزنین میں:

علامہ یاقوت الحموی اپنی کتاب ”معجم البلدان“ میں لکھتے ہیں کہ غزنی ان شہروں میں شمار ہوتا ہے کہ جس میں علماء کا کوئی شمار نہیں اور اس کے باسی دین دار، اہل شریعت اور سلف صالحین کے طریقے کو لازم پکڑنے والے ہیں۔

سلطان محمود جو ہزار سال قبل ۳۵۷ھ میں پیدا ہوا، اس کی پیدائش پر اس کے باپ شاہ غزنی سبکتگین نے سوورہ میں ہندوؤں کا ایک بڑا بت خانہ مسمار کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔

عراق، ایران، سمرقند و بخارا اور افغانستان کے شمال علاقوں بلخ اور نیچے کا بل تک تو اسلام کے پھریرے لہرا ہی رہے تھے جبکہ محمد بن قاسم شیراز سے اٹھ کر سندھ کو ملتان تک اسلام کے نور سے منور کر چکا تھا، اب باقی تو ہندوستان ہی رہ گیا تھا جو کفر اور بت پرستی کا گڑھ تھا۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی کو اپنے باپ کی طرف سے بت توڑنے کی جو گھٹی ملی تھی سلطان بھی اسی راستے پر چلے، بلخ، نیشاپور اور سمرقند و بخارا اور باقی ترکستان سے مسلمان جہاد کی نیت سے غزنی کا رخ کرتے اور سلطان انھیں لے کر ہندوستان میں جہاد کرتا۔

فاتح سومنات کے شہر میں جب ہم پہنچے تو ہوٹل میں کمرالیا، سامان رکھا، کھانا کھایا اور پھر ہم شہر دیکھنے کو نکل کھڑے ہوئے۔ دریا پار کر کے ہم شہر کی بڑی مسجد میں گئے تو وہاں مجاہدین کے ایک لیڈر مولوی عبدالجبار سے ملاقات ہوگئی، وہ اردو بڑی روانی سے بولتے تھے، ہمیں غزنی میں دیکھ کر بڑے حیران ہوئے، کہنے لگے انقلاب کے دن ہیں، اسلمہ کے بغیر آپ کا یوں گھومنا بڑا خطرناک ہے پھر انھوں نے اپنے ہاں رات گزارنے کی پیشکش کی مگر ہم نے ان کا شکریہ ادا کر کے معذرت کی اور کہا کہ اللہ وارث ہے، کوئی بات نہیں، ہمیں بہر حال افغانستان گھومنا ہے۔

غزنی میں ہم تلاش کرتے رہے کہ سلطان کا کوئی محل ہو تو اسے دیکھیں اور تاریخی عمارتیں ہوں تو ان کا نظارہ کریں مگر غزنی جو کہ آج ہمارے کسی چھوٹے سے قصبے جتنا شہر تھا اور صوبہ

غزنی کا دار الحکومت تھا، اس میں ہمیں ایسی کوئی شے دکھائی نہ دی، ایک پہاڑی ٹیلے پر اس کے باپ سبکتگین کا مزار تھا اور اس سے نیچے ایک مینار تھا، ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر پھر ایک مینار تھا، یہ مینار بھی کوئی یادگاری یا زیبائشی نہ تھی بلکہ یہ فوجی اور جہادی مینار تھی کہ جب سلطان جہاد کے لیے ہندوستان کا رخ کرنا تو اسی راستے سے سلطان روانہ ہوتا تھا، ان میناروں سے ختارے بجاتے کہ سلطان جہاد کے لیے روانہ ہو رہا ہے اور جب واپس آتا تو پھر بھی ختارے بجاتے کہ سلطان ہندوستان میں جہاد کر کے، وہاں اسلام کی شمع روشن کر کے اور کفر کا سر توڑ کر غزنی واپس آ گیا ہے۔

ہم سوچ رہے تھے کہ بادشاہ تو یادگاریں بنواتے ہیں، بڑے بڑے محلات تعمیر کروائے ہیں باغات بنواتے ہیں۔ شیخوپورہ کے قریب بادشاہ جہانگیر کا ہرن مرگیا تو اس نے وہاں مینار بنا دیا، اس کے بیٹے شاہ جہان کی بیوی ممتاز محل مر گئی تو اس نے اس کی محبت کی یاد میں تاج محل بنا دیا اور وہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ٹھہرا۔ وہ تو خیر بادشاہ تھے آج کل کے صدر اور وزیر اعظم کیا کم ہیں، ایوب نے مینار پاکستان بنا کر کروڑوں روپے ضائع کر دیے تو بھٹو نے لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا مینار بنا کر بے پناہ پیسہ برباد کر دیا اور اب نواز شریف نے باب پاکستان بنا کر غریبوں کے مال کا بیڑہ غرق کر دیا۔ قوم عادیہ جس پر اللہ نے عذاب بھیج کر اس کا ستیاناس کر دیا، اس کی عادتیں بھی ایسی ہی تھیں، حضرت ہود علیہ السلام انھیں متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

أَنْبَسُونَ بِكُلِّ رِيحٍ آيَةً تَقْبَلُونَ ﴿١٣٧﴾ وَتَسْخَرُونَ مِمَّا بَدَأَ لَكُمْ

تَخْلُقُونَ ﴿١٣٨﴾ (الشعراء: ۱۳۷-۱۳۸)

”کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک فضول یادگار بنا دیتے ہو اور ایسی عمارتیں بناتے ہو گویا تمہیں یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔“

غرض سلطان نے ایسی کوئی عمارت نہ بنائی تھی، اسے تو ایک ہی شوق تھا کہ جہاد کرنا

رہے اور اسلام پھیلاتا رہے۔ ایک مہم سے جو مال غنیمت حاصل ہوتا اسے رعایا کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا اور اگلے جہادی لشکر کی تیاری شروع کر دیتا۔ سلطان کے بنائے ہوئے مینار آج بھی افغانیوں اور پاکستانیوں کے لیے مشعل راہ ہیں کہ افغانستان میں جہادی کامیابی کے بعد اب اپنا رخ اس طرف کر لو جس طرف تمہارے سلطان نے رخ کیا تھا کہ ہندو کے مظالم سے مظلوم مسلمانوں کے تحفظ کا یہی راستہ ہے۔ سلطان نے ہندوستان پر اس وقت سترہ حملے کیے جب وہاں مسلمان نہ تھے، سب ہندو تھے مگر سلطان نے کفر کا زور توڑا، اسلام کی اشاعت کی اور آنے والے وقت میں مسلمانوں کے اقتدار کی راہ ہموار کی اور ایک ہزار سال تک مسلمان حکومت کرتے رہے۔ مگر آج جب کہ پاکستان سے دو گئے مسلمان وہاں موجود ہیں کس قدر ضروری ہے کہ انڈیا کے خلاف سلطانی اقدام کی یاد تازہ کی جائے۔ سلطان غزنی سے یہاں آیا تھا، ہم تو ہندو کے ہمسائے ہیں، اس کے درمیان اور اس کے اندر بیٹھے ہیں لہذا ہماری ذمہ داری تو اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

سلطان کے بت شکن جہاد پر اک نظر:

سلطان نے نگر کوٹ پر حملہ کیا اور یہاں کے ایک بہت بڑے مندر سے ساٹھ لاکھ اشرفیاں، سات سو من سونا چاندی کے اوزار، دو سو من خالص سونا، دو ہزار من خالص چاندی اور بیس من کے انواع و اقسام کے جواہرات لے کر غزنی لوٹا۔

۱۴۰۲ھ میں سلطان جہاد کے لیے اٹھا اور تھائیسر کا رخ کیا، سب راجوں نے مل کر مقابلہ کیا مگر منہ کی کھائی اور سلطان نے یہاں کے سب بتوں کو توڑنے کے بعد ”جگ سوم“ کو توڑنے کا فیصلہ کیا تو راجوں مہاراجوں نے بڑی منتیں کیں کہ سلطان اس کو نہ توڑے اور جتنا مال چاہتا ہے لے لے۔ سلطان نے جواب دیا کہ جب دنیا سے بت پرستی کے رواج کو ختم کر دینا ہی مقصد ہے تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ تھانسیر جیسے بت پرستی کے مرکز کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس کو فتح کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے۔

چنانچہ سلطان نے اس بت ”جگ سوم“ کے کلڑے کر کے انھیں ایک راستے میں پھینک دیا تاکہ گزرنے والے اسے پاؤں کے نیچے پامال کریں اور اس کی بے بسی کو ملاحظہ کر کے اپنے خالق کی طرف رجوع کریں۔

۱۶۰۹ھ میں سلطان کشمیر پہنچا تو کشمیر کا راجا سلطان کی قوت دیکھ کر اطاعت بجالایا اور تحفے تحائف نذر کیے، چونکہ سلطان کا ارادہ قنوج فتح کرنے کا تھا لہذا کشمیر کا راجا بھی سلطان کے ساتھ ہولیا، سلطان نے قنوج فتح کیا اور اس کا راجا جس کا نام ”کورا“ تھا سلطان کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر سلطان نے ”مہتر“ کو فتح کرنے کا پروگرام بنایا، یہ شہر ہندوؤں کے نزدیک خدا کا اوتار کرشن کی جنم بھومی تھا، اس شہر کو فتح کرنے کے بعد سلطان نے غزنی میں جو خط لکھا وہ ملاحظہ کیجیے:

”اس شہر میں ایک ہزار بلند ترین محل ہیں جن میں سے زیادہ تر سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں اور مندر تو اتنی تعداد میں ہیں کہ میں انھیں توڑتے توڑتے تھک گیا ہوں لیکن ان کا شمار نہیں کر سکا، اگر کوئی اس قسم کی عمارت بنانا چاہے تو ممکن ہے کہ ایک لاکھ اشرفیاں خرچ کرنے کے بعد دو سو سال کے عرصے میں بہت ہی مشتاق اور ماہر معماروں کے ہاتھوں اس کام کو انجام دیا جاسکے۔ بے شمار مال غنیمت کے علاوہ یہاں سے پانچ سونے کے بت بھی ہاتھ آئے ہیں جن کی آنکھوں میں یا قوت جڑے ہوئے تھے، ان بیچ تنی طلائی بتوں کے علاوہ چاندی کے سو بت مزید تھے کہ انھیں ڈھال کر سواونٹوں پر لاد ا گیا ہے۔“ (تاریخ فرشتہ)

سلطان سومنات میں:

سلطان کو لوگوں نے بتلایا کہ اب ہندوستان میں سب سے بڑا بت رہ گیا ہے جس کا نام سومنات ہے، ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کی روح اس کے بدن سے جدا ہو کر اس بت

کے سامنے حاضر ہوتی ہے اور پھر عقیدہ تاسخ کے مطابق سومنات اسے نیا جسم عطا کرتا ہے اور یہ کہ سومنات سارے ہندوستان کے بتوں کا بادشاہ ہے اور باقی سب بت جو محمود نے توڑے وہ تو اس کے دربان اور چہڑا ہی تھے، سومنات اپنے چہڑا سیوں سے ناراض تھا اس لیے محمود نے ان کو توڑ دیا، سومنات کی طرف رخ کرے گا تو برباد ہو جائے گا۔

سلطان نے یہ سنا تو ۱۴۱۵ھ میں سومنات کا رخ کر لیا۔ رمضان کے مہینے میں جب سلطان کا لشکر سومنات کے قریب پہنچا تو اہل سومنات قلع کی دیوار پر کھڑے ہو کر چیخ چیخ کر یہ کہہ رہے تھے کہ تم خود نہیں آئے، ہمارا معبود سومنات تم کو یہاں کھینچ کر لایا ہے تاکہ تم سب کو ایک ہی بار تباہ کر دے اور اپنے غلام بتوں کا تم سے بدلہ لے۔ یہ کہنے کے باوجود ہندوؤں کا لشکر سلطان کے لشکر سے خوب لڑا حتیٰ کہ سارا لشکر برباد ہو گیا۔

یہ مندر اتنا بڑا تھا کہ ہندوستان کے سب راجے اس کے لیے جاگیریں وقف کیا کرتے تھے، یہاں ہر وقت دو ہزار برہمن پوجا پاٹ کے لیے حاضر رہتے۔ ان پجاریوں نے مندر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سونے کی ایک زنجیر باندھ رکھی تھی، جس کا وزن دو سو من تھا، اس میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں، پوجا کے وقت اس کو بلایا جاتا اور لوگ پوجا شروع کر دیتے۔ یہاں پانچ سو گانے بجانے والی خوبصورت عورتیں اور تین سو قول ملازم تھے۔ ہندوستان کے بیشتر راجے اپنی بیٹیوں کو سومنات کی خدمت کے لیے یہاں بھیجتے، وہ ساری عمر کنواری رہتیں اور مندر کی خدمت کرتیں، انھیں ”دیوداسیاں“ کہا جاتا تھا..... یہ ساری چیزیں اور کنیزیں تو سلطان کے ہاتھ میں مال غنیمت تھا ہی جب کہ سونا چاندی اور جواہرات اس قدر تھے کہ تاریخ فرشتہ کے مطابق اس کا دسواں حصہ بھی آج تک کسی سلطان کے خزانے میں جمع نہ ہوا ہوگا۔

سلطان نے جب سومنات کو توڑا:

جب سلطان مندر کے اس ہال میں داخل ہوا جہاں سومنات بت تھا تو وہ اتنا بڑا تھا کہ

اس کی چھت ۵۶ ستونوں پر قائم تھی، وہاں مصنوعی یا سورج کی روشنی کا کوئی بندوبست نہ تھا، وہاں جو روشنی تھی وہ اعلیٰ درجے کے جواہرات کی شعائیں تھیں جو اس ہال کی قدیلوں میں جڑے ہوئے تھے۔ یہاں سونے چاندی کے چھوٹے چھوٹے بتوں کو روندنے کے بعد سلطان سومنات کے بڑے اور بادشاہ بت کے سامنے جا کھڑا ہوا، یہ پانچ گزی یعنی ۱۵ فٹ لمبا تھا، چھ فٹ زمین میں گڑا ہوا تھا اور نو فٹ زمین پر بلند تھا۔

اس دوران شہر کے معزز ہندوؤں نے سلطان تک یہ عرضداشت پیش کی کہ آپ کو جس قدر مال و زر چاہیے ہم حضور کے قدموں میں نچھاور کیے دیتے ہیں مگر سومنات کو کچھ نہ کہیے۔ سلطان کے بعض امراء نے بھی مشورہ دیا کہ سنگ مرمر کے اس بت کو توڑنے کا کیا فائدہ؟ ہم مال لے لیں، مسلمانوں کے کام آئے گا..... سلطان نے یہ سن کر کہا:

”اگر میں نے تمہاری بات مان لی تو دنیا مجھے بت فروش کہے گی جبکہ مجھے یہی بہتر

معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں مجھے محمودت شمن پکارا جائے۔“

یہ کہتے ہی سلطان کی توحیدی غیرت جوش میں آئی اور سلطان نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گرز سومنات کے دے مارا، اس کا منہ ٹوٹ کر دوڑ جاگرا، پھر سلطان کے حکم پر اس کے دو ٹکڑے کیے گئے تو اس کے پیٹ سے اس قدر اور بیش قیمت ہیرے، جواہرات اور موتی نکلے کہ جو ہندو معززین اور راجوں کی پیش کردہ رقم سے سو گنا زیادہ تھے۔

سلطان محمود کی قبر پر:

اب ہم غزنی کے قبرستان کی طرف چل دیے، یہاں ان ساڑھے چار سو مجاہدین کی قبریں ہیں جنہیں روسیوں کے خلاف مزاحمت کرنے پر ایک ساتھ موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ اس سے چند میٹر ہیاں اوپر چڑھیں تو چھوٹے سے باغیچے میں اس مرد مجاہد کی قبر ہے کہ جس کے دور میں علامہ یاقوت الحموی کی شہادت کے بعد ابن حزم اپنی کتاب ”فتوح الاسلام“ میں لکھتے ہیں کہ سلطان چونکہ اہل حدیث تھے اسی وجہ سے علاقہ کے لوگوں کی اکثریت اہل حدیث

تھی۔ اسی طرح صاحب ”حقیقۃ الفقہ“ نے مصر سے چھپی ہوئی کتاب ”حیۃ الحیوان الکبریٰ“ کے حوالے سے سلطان کے دربار کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان کے دربار میں فقہ حنفی کے مطابق بغیر رفع الیدین کے جلدی جلدی نماز پڑھی گئی اور پھر حدیث کے مطابق رفع الیدین کے ساتھ مکمل سکون اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کی گئی تو سلطان نے اس کے بعد رفع الیدین کے ساتھ سنت کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دی۔

تاریخین محترم.....! یہ تھے وہ مجاہد اور بت شکن موحد، حقیقت سامنے آنے پر فوراً سنت کا دامن تھامنے والا رسول عربی ﷺ کا محب، شرک اور بت پرستی کا شمشیر جہاد سے قلع قمع کرنے والا کہ جس کے نام سے آج بھی ہندوکانپ اٹھتا ہے، ہم اس کے مرقد پر کھڑے تھے کہ ہاتھ بے اختیار اس کی مغفرت کے لیے اٹھ گئے۔

کشمیر کی یاد:

میرے مجاہد ساتھی کو کشمیری یاد آگئے، ظالم ہندو یاد آگئے، وہ کہنے لگے میں مظفر آباد میں تھا، مقبوضہ کشمیر سے ایک قافلہ آیا، اس قافلے کے ایک مجاہد نے مجھے بتلایا ہم چند ساتھی دہلی کی ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ ایک گھر کے دروازے پر کھڑی بڑھیا نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں بلایا، وہ ہمارے چہرے مہرے سے پہچان گئی تھی کہ ہم مسلمان ہیں اور جب ہم نے بتلایا کہ ہم کشمیری ہیں اور مجاہد بھی ہیں تو وہ رو کر کہنے لگی:

”بیٹو! ۱۹۴۷ء میں میں ہندوؤں کے ہاتھ آگئی، میں مسلمانوں کی بیٹی اب تک اس بدن سے سات ہندو پیدا کر کے اب بوڑھی ہوگئی ہوں، بیٹا! بدلہ لے کر رہنا، جہاد سے پیچھے نہ ہٹنا۔“

تاریخین کرام! ایک غزنی ہی نہیں بلکہ افغانستان میں ہم جہاں بھی گئے، جس کو بھی معلوم ہوا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں، اس نے دل اور آنکھیں فرش راہ کر دیں اور اس عزم کا اظہار ضرور کیا کہ جس طرح آپ ہمارے ساتھ افغانستان آئے ہیں، اسی طرح ہم آپ کے

ساتھ کشمیر جائیں گے۔ (ان شاء اللہ) تو..... دہلی کی اس بوڑھی اماں کی آواز اور اس جیسی ہزاروں مظلوم آوازیں..... وہ کشمیر کے چناروں سے اٹھ رہی ہیں اور وہ کہ جو باقی ہندوستان کے کونوں سے..... ان آوازوں پر اب وہ کان لگے ہوئے ہیں جو قرآن کا یہ مقام سنتے ہیں:

”ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام جانتے ہیں اور نہ ہی دین حق قبول کرتے ہیں، ان لوگوں سے بھی قتال کرو جنہیں کتاب دی گئی ہے حتیٰ کہ وہ پست ہو کر جزیہ دیں اور ذلیل ہو کر رہیں۔“ (التوبة: ۲۹)

غور فرمائیے! اس آیت میں واضح طور پر ہندوؤں، بدھ متوں اور یہود و نصاریٰ سے جہاد کا حکم ہے، کوئی دفاعی انداز نہیں بلکہ قرآن اپنے ماننے والوں سے جارحیت اور اقدام چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری وزارت کا نام وزارت دفاع نہیں بلکہ وزارت حرب یا وزارت جنگ یا وزارت جہاد و قتال ہونا چاہیے۔ سلطان محمود اسی پر عمل کرتا تھا اور ہندوؤں کو باجگوار بنا کر رکھتا تھا۔

اب پھر غزنی کے وطن سے، شہاب الدین غوری کے ملک سے، قطب الدین ایبک کے علاقے سے اور اوپر سمرقند و بخارا کی جانب سے..... بابر کی وادی فرغانہ کی طرف سے پھر قافلے آنے کو ہیں، خیبر سے گزر کر پاکستانی بھائیوں کے ہمراہ ہو کر کشمیر، دہلی اور سومات کی طرف مارچ کرنے والے ہیں۔ (ان شاء اللہ)

غزنی سے واپسی:

رات ہوئی میں بسر کی، صبح سویرے اٹھے، غزنی کا ایک بوڑھا بابا بالائی اور دودھ کے پیالے لے کر بیٹھا تھا، غزنی کی گائے کا مکھن ہمارے پاس موجود تھا، بالائی اور مکھن کے ساتھ تازہ لمبی سی انگانی روٹی کھائی، تہہ پیا اور واپس کابل کو چل دیے۔ صوبہ غزنی کے بعد صوبہ وردگ آیا اور پھر وہی کابل، کابل کا پلازا ہوئی اور شیخ ولی اللہ سے غزنی کی باتیں،

سلطان کی یادیں۔

کابل کے ایئر پورٹ کے وی آئی پی روم میں گلم جم کے جرنیلوں کے ساتھ:

غزنی کے سفر نے ہمیں بہت تھکا دیا تھا چنانچہ اب سوچا کہ مزار شریف جانے کے لیے ہوائی جہاز کا پتا کریں۔ چنانچہ ہم دونوں ہم سفر ساتھی کابل ایئر پورٹ پہنچے، پاکستانی ہونے کے ناتے ہر جگہ ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا گیا، ایئر پورٹ کہ جہاں عام لوگوں کو جانے کی بالکل اجازت نہ تھی، ہمیں ایئر پورٹ کے معاملات کے نگران قومندان پناہ خان کے پاس لے جایا گیا، تعارف اور ملاقات کے بعد انہوں نے کہا کہ کل صبح مزار شریف ہوائی جہاز جائے گا آپ اس میں تشریف لے جائیں جب کہ رات میرے پاس بسر کریں۔ ہم نے کہا صبح حاضر ہو جائیں گے جبکہ قیام ہمارا ہوکل میں ہے۔

۱۲ مئی کی صبح ہم ایئر پورٹ پر پہنچے، قومندان خان نے ہمیں رقعہ دیا اور گلم جم ملیشیا کے ایک انس کو ہدایت کی کہ یہ ہمارے پاکستانی مجاہد ساتھی ہیں، ان کو ہوائی جہاز میں سوار کر دیجیے۔

آفیسر نے ہمیں ایئر پورٹ کے گیٹ پر پہنچنے کو کہا ہم وہاں پہنچے، سکیورٹی والوں کو پناہ خان کا خط دیا، ایک آدھ منٹ کے بعد وہ واپس آگئے اور ہمیں اندر چلنے کو کہا..... سکیورٹی والوں نے ہمارے بیگ اٹھا کر ایک جگہ رکھ دیے اور ہمیں کابل ایئر پورٹ کے وی آئی پی روم میں چلنے کو کہا۔ ہم اس میں داخل ہوئے تو وہاں گلم جم ملیشیا کے دو جرنیل موجود تھے انہوں نے ہمیں بڑی عزت افزائی کے ساتھ بٹھایا اور پھر تعارف کے بعد گفتگو شروع کر دی۔

ان دو جرنیلوں میں ایک جنرل عبدالحجید تھا، یہ گلم جم ملیشیا کے سربراہ جنرل عبدالرشید دوستم کا بھائی اور کابل میں گلم جم ملیشیا کو کنٹرول کرنے والا ہے جبکہ جنرل عبدالرشید مزار شریف میں بیٹھا ہے..... جنرل عبدالحجید نے مجھ سے سوال کیا کہ موجودہ جماعتوں میں سے آپ کے خیال میں کون سی اچھی ہے؟ میں نے کہا سیاف ہو یا حکمت یار، ربانی ہو یا مولوی

خالص سب نے آپ کے خلاف جہاد کیا ہے، لہذا سب ہی بہتر ہیں۔ پھر کہنے لگا اب جو حکمت یار اور مسعود میں ٹھنی ہوئی ہے، چھڑپیں بھی ہوئیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جنگ اسلام کے لیے نہیں اقتدار کے لیے ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے الزامی جواب دوں کہ تم کمیونسٹوں کی خلق اور پرچم پارٹیاں ایک دوسرے کی دشمن ہیں اور کس قدر انہوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا ہے مگر پھر میں نے یہ جواب اس لیے نہ دیا کہ اس کا مطلب تو یہ تھا کہ جیسے تم لڑتے ہو ایسے ہی مجاہدین لڑتے ہیں..... جبکہ میں نے اسے کہا کہ قبائلی معاشرے میں چودہ سالہ جہاد کے بعد (اب درمیان میں الجھن کی وجہ سے) مجاہدین کے درمیان جو اختلافات دکھائی دیتے ہیں آپ دیکھیں گے کہ یہ ان شاء اللہ عنقریب ختم ہو جائیں گے۔ پھر اس نے پوچھا کہ آپ کہاں جہاد کرتے رہے ہیں تو میرے مجاہد ساتھی ابوشرحبیل نے بتایا کہ یہیں کابل کے قریب تیزین کے مقام پر ہم کابل کی جانب اسی ایئر پورٹ کی طرف کولے برساتے رہے ہیں جبکہ لوگر کی طرف بھی ہم آپ کے خلاف لڑتے رہے ہیں..... اور اب؟ میں نے کہا اب ان شاء اللہ کشمیر میں کام تیز ہے اور یہ میرے مجاہد ساتھی وہاں مصروف جہاد ہیں۔ اب اس نے میرے مجاہد ساتھی کو سگریٹ پیش کیا تو ابوشرحبیل نے اسے مزاقاً یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ یہ خوراک آپ ہی کے لیے ہے۔

یہ گفتگو جاری تھی کہ ایک شخص اندر داخل ہوا اور کہا کہ جہاز تیار ہے۔ چنانچہ اب ہم جہاز کی طرف چل دیے، جنرل عبدالمجید بھی ہمراہ ہولیا، جہاز کے قریب جا کر اس نے ایک آدمی کو ہدایت کی کہ ان دو مسافروں کا خیال رکھنا۔ ہم الواوئی ملاقات کر کے جہاز میں سوار ہو گئے اور آپس میں گفتگو کرتے تھے کہ یہی وہ ایئر پورٹ ہے جہاں سے اڑ کر جہاز ہم پر بمباری کیا کرتے تھے، آج الحمد للہ جہاد کے راستے سے فتح کا وہ مبارک دن ہے کہ ایک مجاہد کی ہدایت پر ہم وی آئی پی روم میں بیٹھتے ہیں، اس جنرل سے جہاد کی باتیں کرتے ہیں اور سگریٹ کو اس کی خوراک قرار دیتے ہیں کہ جو اس ملیشیا کا جنرل ہے، جو اپنی چنگیزیت میں معروف

ہے۔ ہمیں شیخ ولی اللہ نے بتلایا تھا کہ یہ گلم جم ملیشیا والے ازبک ہیں، چنگیز خان کی اولاد سے ہیں، روس میں انہوں نے تربیت پائی ہے اور گلم جم کا مطلب ہے دری کو لپیٹ دینا یعنی یہ اپنے مخالفوں کو دری کی طرح لپیٹ کر اسے بچھا دیتے ہیں..... احمد شاہ مسعود کے ساتھ مل کر یہ نجیب کے خاتمے کا سبب بنے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کابل میں موجود ہیں مگر اس کے باوجود ہم نے جو مشاہدہ کیا وہ یہ تھا کہ یہ ملیشیا مجاہدین کے سامنے پست اور شکست خوردگی کی حالت میں موجود ہے اور اس پر سب سے بڑی دلیل خود ہماری وی آئی پی روم میں موجودگی اور ان سے گفتگو تھی۔ یہ محض جہاد کے راستے کی عظمت اور عزت تھی جس سے اللہ نے مجاہدین کو سرخرو فرمایا ہے۔

ہوائی ٹرک میں سفر:

یہ جہاز جس میں ہم سوار ہوئے اسے ہوائی ٹرک بلکہ ہوائی گڈ کہنا زیادہ درست ہوگا، اس نے اڑان کے لیے کابل ایئر پورٹ پر ایک چکر لگایا اور پھر ورکشاپ جا کر یہ ہوائی ٹرک کھڑا ہو گیا۔ ہمیں بتلایا گیا کہ مزار شریف کا موسم خراب ہے اس لیے انتظار کریں۔ اکثر مسافر مجاہدین تھے، راکٹ لائجر، آر بی، جی اور کلاشکوفین اٹھائے ہوئے تھے۔ بہر حال سب ہی رن وے پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں ساتھی کچھ دیر فرش پر ہی سوکر اٹھے تو دو بچے کو تھے، صبح کا ناشتہ بھی نہ کیا تھا، چنانچہ بھوک بھی بہت لگ چکی تھی، میرے ساتھی نے ابھی روٹی کا نام لیا تو اللہ نے روٹی بھیج دی، ایک مجاہد ہاتھ میں روٹی پکڑے اور پانی کا برتن تھامے ہماری طرف بڑھنے لگا اور پھر اس نے یہ کھانا ہمارے حوالے کر دیا، سب ہی لوگ اس طرح کا کھانا یعنی خیر اور تین چار انچ موٹی روٹی پانی میں بھگو کر کھا رہے تھے، چنانچہ ہم نے بھی یہ کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

چار بجے اعلان ہوا کہ موسم ٹھیک نہیں ہو رہا لہذا جہاز کل جائے گا۔ چنانچہ ہم دوسرے روز پھر ایئر پورٹ پر پہنچ گئے، دوسرے مسافروں کے ہمراہ بیٹھ گئے، اس روز قوم متحدہ کا

نمائندہ نیشنل سیوان اور دیگر امریکی عہدیدار بھی ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ نیشنل سیوان تو ہمارے قریب ہی گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا اکیلا ہی چہل قدمی کر رہا تھا..... سوچتا ہوگا کہ گلم جم ملیشیا کا مستقل کردار افغانستان میں کیسے برقرار رکھا جائے، مجاہدین کو آپس میں جنگ کی بھٹی میں جھونک کر جہاد کے ثمرات کو کیسے برباد کیا جائے..... اور یہ بات یونہی نہیں ہے بلکہ افغان مجاہدین کی ایک انتہائی ذمہ دار شخصیت نے کابل میں مجھے یہ بات بتلائی کہ اقوام متحدہ کے امریکی نمائندے اپنی چالبازیوں سے پوری کوششیں کر رہے ہیں کہ مجاہدین آپس میں لڑیں اور علاقائی اور لسانی تعصبات کی آگ میں کود جائیں..... مگر اللہ کے فضل سے ان کی یہ کوششیں برباد ہوتی جا رہی ہیں۔

ہم نے سوچا کل والا جہاز شاید یہیں آئے گا مگر اسے تو کل والی جگہ سے ہی اڑنا تھا، چنانچہ اب جو اس کی روانگی کی خبر ہوئی تو ہم اس کی طرف گئے، ہمارے ساتھ چار پانچ اور بھی مسافر لیٹ ہو گئے تھے، بہر حال ہم پہنچے تو جہاز چل پڑا تھا، ہم نے بھاگ کر اسے ہاتھ دیا، پائیلٹ نے لحو بھر کے لیے روکا مگر وہاں موجود انسرنے بتلایا کہ ایک اور جہاز بھی جانے والا ہے اس پر چلے جائیں۔ چنانچہ یہ جہاز روانہ ہو گیا جبکہ ہم پچھلے جہاز پر جا بیٹھے، اس جہاز میں کچھ خرابی تھی بہر حال اسے درست کرنے کے بعد آخر کار یہ چل پڑا۔

میں نے جہاز کو ہوائی ٹرک کا نام اس لیے دیا ہے کہ یہ دراصل مال بردار فوجی جہاز ہیں، اب ان میں سفر بھی ہوتا ہے، مال بھی لادا جاتا ہے اور جنگ کے دنوں میں مجاہدین پر ان جہازوں سے بمباری بھی کی جاتی تھی۔ افغانستان اس قدر تباہ حال ہو چکا تھا کہ ان جہازوں میں کوئی ایک بھی صحیح حالت میں نہیں ہے، ہر دفعہ مرمت کر کے روانہ کیا جاتا ہے، جہاز میں جو ارد گرد باہر دیکھنے کے لیے شیشے والی کھڑکیاں لگی ہوتی ہیں، مسافر اندر بیٹھے بیٹھے جس کی وجہ سے انہیں اتار دیتے، جہاز چلنے لگتا تو انہیں پھر ساتھ چمنا دیا جاتا۔ بہر حال یہ جہاز فضا میں اڑنے لگا، پائیلٹ کا معاون پیچھے آیا، اس نے ہم دونوں کو اٹھایا اور فسٹ کلاس وی آئی

پی کیبن میں لے گیا اور وہاں لے جا کر احمد شاہ مسعود کی شورٹی نظار کے وزیر مالیات کے ساتھ جا بٹھایا۔ یہاں اور بھی کئی اعلیٰ شخصیات موجود تھیں مگر یہ وی آئی پی کیبن بھی ہماری منی بس کی طرح کا تھا کہ جس کی سیٹیں لوہے کی اور وہ بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ہم افغانوں کی اس مہمان نوازی اور پاکستانیوں کے لیے عزت افزائی پر بہر حال بڑے خوش تھے اور اس بات پر بھی کہ ہوئی اڈے کا ایک بڑا آفیسر جو کہ ہمارے ساتھ ہی مزار شریف اپنے گھر جا رہا تھا، کہنے لگا کہ وہاں میرا گھر ہے اور گھر کے ساتھ ہی میرا عالی شان ہوٹل ہے، وہ ہم سے ایئر پورٹ پر بڑے دوستانہ ماحول میں گفتگو کرتا رہا تھا۔ ایئر پورٹ پر ایک تباہ شدہ جہاز کھڑا تھا، میں نے اس سے اس کے بارے پوچھا تو وہ کہنے لگا ہمارے اندر ایک مجاہد تھا، اس نے اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا، ایک روز اس نے اس طیارے میں بم رکھ دیا جس سے یہ تباہ ہو گیا، یہ مجاہد قید کر لیا گیا اور ابھی چرخی جیل سے رہا ہوا ہے۔

اب طیارے میں بیٹھا میں سوچ رہا تھا کہ مزار شریف میں اس آفیسر کے ہوٹل میں رہیں گے..... مگر جہاز ۲۵ منٹ ہی اڑا تھا کہ واپس کا بل ایئر پورٹ آ گیا، پتا چلا کہ اس کے پیسے بند نہیں ہوئے۔ اس کے پیسے تو ٹھیک نہ ہوئے کہ ایک اور جہاز تیار ہوا، اب ہم اس میں سوار ہو گئے، یہ چلنے لگا تو پتہ چلا کہ اس کے دروازے بند نہیں ہوتے، اب انھیں ٹھیک کیا جانے لگا، دو تین گھنٹوں کے بعد جب وہ ٹھیک ہوئے تو اب مزار شریف کا موسم خراب ہو گیا، کچھ دیر موسم کا انتظار ہوا مگر ٹھیک نہ ہوا۔ چنانچہ پائیلٹ نے کہا اب بہتر یہ ہے کہ کل صبح تشریف لے آئیں، ہم مزار شریف جائیں گے۔

یہ سن کر ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب ان گڈوں پر نہیں جائیں گے بلکہ بس ہی بہتر ہے۔ تو جب ہم ایئر پورٹ سے باہر آئے، مجاہدین کی ایک سرکاری گاڑی تھی، اس میں بیٹھ گئے اور انھیں کہا کہ ہم تو پلازا ہوٹل جائیں گے جبکہ آپ نے جہاں تک جانا ہے وہیں کسی مناسب جگہ اتار دیں۔ تب تو وہ کہنے لگے یہ جہادی حکومت کی گاڑی ہے، ہم مجاہدین ہیں آپ بھی مجاہدین

ہیں، جتنا ہمارا حق ہے اتنا ہی تمہارا حق ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو راستے میں اتا روئیں، وہیں تک چھوڑ کر آئیں گے جہاں آپ چاہیں گے۔ چنانچہ ہم ان مجاہد بھائیوں کا شکر یہ ادا کر کے مظلوم بگڑے اور ایک ریر بھی والے سے انگوروں کا پانی پیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو اس نے باوجود اصرار کے ہم سے پیسے نہ لیے، یہ واوی پنج شیر کا رہنے والا تھا۔

مسلمانوں اور مجاہدوں کی یہ وہ باہمی محبت اور الفت ہے جس نے جہاد کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور جسے افغانستان میں ہم نے قدم قدم پر دیکھا ہے، یہ دیکھ کر اور زیادہ پختہ یقین ہو گیا کہ دنیا بھر میں مسلمان جہاد کے نبوی سلسلے کو جاری رکھیں گے تو ساری دنیا کے مسلمان ایک وقت آئے گا کہ عقیدہ توحید اور جہاد منج پر ایک ہو جائیں اور یہی وہ حقیقت ہے کہ جس سے آج کفر کانپ رہا ہے۔



روس کے تعاقب میں

شاہراہ سالانگ پر نہر جیحون (دریائے آمو) تک

۱۴ مئی کو صبح چھ بجے ہم کابل سے روانہ ہوئے، شہر سے نکلنے کے بعد اب ہم اس سڑک پر محو سفر تھے جسے شاہراہ سالانگ کہا جاتا ہے۔ سارے افغانستان میں کابل سے آمو تک یہی وہ واحد سڑک ہے جو صحیح حالت میں ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہی وہ راستہ تھا جس سے روسی فوجی کابل میں اسلحہ لاتے تھے اور یہی وہ راستہ ہے جس سے انھیں بھاگ کر واپس جانا تھا۔

دواڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد صوبہ پروان کا دارالحکومت چاریکار کا شہر تھا اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ”جبل السراج“ تھا، یہیں سے دائیں جانب پنج شیر کو سڑک جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ کابل سے ”جبل السراج“ تک وادی بڑی کشادہ اور سڑک بالکل ہموار ہے ایسے کہ جیسے پنجاب کی کسی سڑک پر سفر ہو رہا ہے جبکہ ”جبل السراج“ کے بعد تنگ وادی شروع ہو جاتی ہے۔ اس وادی میں بل کھاتے ہوئے دریائے سالانگ کے کنارے دریائے کابل کی طرح روسی بربادیوں کے بے شمار نشانات ہیں، وہ نشانات برباد شدہ ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں، تیل کے ٹینکروں اور فوجی جیپوں کی صورت میں ہیں۔ اس وادی کے وہ بلند و بالا خشک پہاڑ کہ جن کی بلندیاں آسمان کو چھو رہی ہیں، ان بلندیوں سے ریگ ریگ کر اور چھپ چھپ کر جب مجاہدین سالانگ سڑک پر رواں روسی قافلوں پر حملہ آور ہوتے تھے، انھیں جہنم واصل کرتے تھے تو کریملن میں بیٹھے روسی زعماسر پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے

کہ ہمارا کس قوم سے واسطہ پڑا ہے کہ جو مہینوں سفر کرنے کے بعد دشتوں، دریاؤں اور سنگاخ پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ غرض جبل اسراج سے کوہ سالانگ تک وادی کا ایک ایک چپہ روسی بربادیوں اور انغان مجاہدوں کی عظمتوں کا حال سنا رہا تھا کہ روسیوں نے اس خوبصورت وادی میں بیسیوں بستیوں میں ایک بھی سلامت نہیں چھوڑی اور پھر کسی بستی کا ایک گھر بھی تو اصل حالت میں دکھائی نہیں دیتا۔ روسیوں نے یہاں کے مکینوں کو شہید کیا، جو باقی بچے وہ مہاجر ہوئے، ان کا اثاثہ روسیوں کے ہاتھ آیا حتیٰ کہ ان کے مکانوں کی چھتوں کی لکڑیوں کو اکھاڑ کر انھیں اپنے مورچوں میں استعمال کیا۔ مگر یہ سب کچھ کرنے کے بعد روسی اور زیادہ غیر محفوظ ہو گئے، پہلے تو مجاہدین کنارے پر آبادیوں کی وجہ سے جہادی کارروائیاں کرتے ہوئے جو تھوڑا بہت ہچکچاتے تھے کہ جہادی کارروائی کے بعد روسی ورنہ آبادیوں کے بے گناہ لوگوں پر اپنا غصہ نکالتے تھے مگر اب وہ ہچکچاہٹ بھی ختم ہو چکی تھی، اس لیے کہ نہ کوئی مکان رہا اور نہ کوئی مکین۔ چنانچہ جہاد کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد مجاہدین نے اب روسیوں پر بے دریغ کارروائیاں کرنا شروع کر دیں اور عظمتوں کی وہ تاریخ رقم کی جس کا مشاہدہ اس سڑک پر سفر کرنے سے ہی ہوتا ہے۔

کوہ سالانگ پر:

اس وادی کا سفر مکمل ہونے کے بعد اب ہمیں کوہ سالانگ پر چڑھنا تھا، چڑھائی سے قبل دریا کے پل پر گلم جم ملیشیا والے چیکنگ کر رہے تھے، گاڑیوں کی ایک لمبی لائن تھی، چنانچہ ہم نیچے اترے اور میں نے کچھ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کی تصویر بنانا چاہی جو کہ اوندھے منہ دریا میں اور اس کے کنارے گری ہوئی تھیں تاکہ انھیں مجلہ کے صفحات پر شائع کر کے قارئین کو بتلا سکوں کہ روس افغانستان میں قدم قدم پر اس طرح اوندھے منہ گرا ہے کہ کہیں اس کے دانت ٹوٹے ہوئے ہیں، کہیں ناک کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے اور کہیں جڑ سلامت نہیں ہے اور اب اسی حالت میں وہ دنیا کے نقشے پر موجود ہے، وہ روس کہ جو کبھی سپر پاور ہوا کرتا تھا۔

مگر جب میں سڑک کے نیچے چلنے لگا تو گلم جم کا ایک فوجی دوڑتا ہوا میری طرف آیا اور اس نے کہا سڑک کے دائیں بائیں ہر طرف بارودی سرنگیں بچھی ہیں اس لیے سڑک سے ہٹ کر چلنا خطرناک ہے۔

میں سوچنے لگا کہ کس قدر بزدل تھے یہ روسی کہ جنھوں نے مختلف قیمتی چیزوں حتیٰ کہ کھلونوں کو بھی بم کی شکل دے کر افغانستان کے میدانوں اور وادیوں میں بکھیر دیا تھا کہ جب معصوم افغان بچہ بھی روسی کھلونا اٹھائے تو اسے دونوں ہاتھوں سے محرومی کا تحفہ ملے، کسی کو آنکھوں سے محرومی کا تحفہ ملے اور کسی کو سارے چہرے کے لہولہان ہو جانے کے بعد سرخ انقلاب کی سرخی کا ہدیہ ملے۔ بارودی سرنگوں پر پاؤں پڑنے سے کسی کے پاؤں نہ رہیں، کسی کی ٹانگیں اڑ جائیں اور کوئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ غرض ان سرنگوں اور کھلونوں کا شکار آج افغانستان میں بے شمار افغان بڑے اور بچے دکھائی دیں گے..... مگر یہ کچھ کرنے کے بعد بھی جب اس قوم سے روسی محفوظ نہ ہوئے تو یہ بڑے شہروں کے گرد سرنگیں بچھا کر خود ہی محصور ہو کر بیٹھ گئے۔

مگر..... کب تک؟ آخر کار اس شاہراہ سالانگ کے ذریعے انھیں واپس بھاگنا ہی پڑا۔ اس سلسلہ ہائے کوہ پر کہ جس کا نام سالانگ ہے اور اسی مناسبت سے اس سڑک کا نام بھی سالانگ ہے، اب ہم اس پر چڑھ رہے تھے، مٹی کے مہینے میں بھی یہ پہاڑ برف باری کی زد میں تھے، ہر سو برف ہی برف تھی، ڈیڑھ دو گھنٹوں کے لگ بھگ ان برفانی پہاڑوں پر سفر کیا، روسی چوکیاں اور چھاؤنیاں دیکھیں کہ جن میں سے کئی ابھی تک برف میں دبئی ہوئی تھیں..... سوچا تھا کہ شاید ان برفانی چوٹیوں پر، سالانگ کی چوٹیوں پر روسی محفوظ رہے ہوں گے مگر آفرین ہے مجاہدوں پر کہ انھوں نے یہاں بھی ان کانفرمیٹیوں کو ان کے ظلم و ستم کا بدلہ خوب چکھلایا کہ یہاں بھی روسی بربادیوں کے نشانات کم نہ تھے، یہاں بھی تباہ شدہ گاڑیاں اور ٹینک روس کی بربادی کا حال بنا رہے تھے۔

برف یہاں اس قدر ہوتی ہے کہ اس سے بچاؤ کے لیے اس سلسلہ ہائے کوہ پر بہت سی سرنگیں تعمیر کی گئی ہیں، ایک سرنگ تو اس قدر لمبی تھی کہ بس کو اس میں کم از کم پندرہ منٹ تک چلنا پڑا۔ اس گھپ اندھیری سرنگ میں لائٹوں کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔

پل خمری میں:

کوہ سالانگ سے نیچے اترے تو اب صوبہ بغلان کا ایک قصبہ ”نخجان“ آیا، اس کے بعد ”دوشی“ اور پھر ”پل خمری“ کا شہر آیا، پل خمری کافی بارونق، بڑا اور اچھا شہر ہے، یہاں سے دو بڑے راستے اور سڑکیں جدا ہوتی ہیں، بائیں طرف کا راستہ کہ جو شاہراہ سالانگ ہی کہلاتا ہے، یہ ایک اور مزار شریف سے ہو کر دریائے آمو پار کر کے ازبکستان سے جا ملتا ہے۔ اس راستے کا پہلا شہر ایک ہے اور سلطان قطب الدین ایک کہ جو شہاب الدین غوری کے بعد ہندوستان کا بادشاہ بنا تھا، اس کی قبر آج بھی نیو انارکلی لاہور کے پہلو میں ہے، وہ ایک کا باسی ہے۔ اس کے بعد افغانستان کا کابل کے بعد دوسرا بڑا شہر مزار شریف ہے۔

مزار شریف سے یہ سڑک ”حیرتان“ تک جاتی ہے، اسی مقام پر دریائے آمو پر پل ہے کہ جب روسی فوج افغانستان سے دم دبا کر بھاگی اور منت سماجت کی کہ ہمیں بھاگتے ہوئے مارا نہ جائے یعنی بھاگنے دیا جائے تو روسی فوج کے جرنیل نے اس پل کو پار کرنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا اور توبہ کی کہ اب جو کوئی روسی اس پل کو پار کرے..... مگر جہاں روسی جرنیل کھڑا تھا اسی مقام پر اس کے قریب ”ترمذ“ کا قصبہ واقع ہے اور دریائے جیحون پار کرتے ہی یہ قصبہ ماواراء النہر ”دریا کے پار“ کا قصبہ بن جاتا ہے، وہ قصبہ کہ جس کے رہنے والے امام ابوعلیسی ترمذی تھے، جنہوں نے حدیث کی وہ کتاب لکھی جو صحاح ستہ میں بخاری و مسلم کے بعد تیسرے درجے کی ہے۔

قتدوز کی جانب:

کابل سے شمالی علاقوں کی طرف روانگی سے ایک روز قبل نوجوان عالم دین عبدالعلیم صدیقی پلازا ہوٹل میں تشریف لائے، تعارف ہوا تو فرمانے لگے کہ مجلۃ الدعوة کے حوالے سے آپ کا غائبانہ تعارف تو تھا ہی، بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج ملاقات بھی ہوگئی اور وہ بھی کابل میں۔ مولانا آج کل ”دیر“ میں جماعت الدعوة کی طرف سے دعوتِ توحید میں مصروف کار ہیں، اصلاً یہ دریائے آمو کے کنارے آباد ایک قصبے ”دشت ارچی“ کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے بتلایا کہ وہاں جماعت الدعوة کی طرف سے باقاعدہ محاذ اور مجاہدین کی قراگاہیں ہیں لہذا آپ وہاں ضرور جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بھائی مولانا عزیز اللہ اور مولانا عبدالباقی کی طرف ہمیں خط لکھ دیا۔ اب ہم اپنے سلفی بھائیوں سے ملاقات کرنے کے لیے دریائے آمو کے پار دشت ارچی جانے کا پروگرام بنا چکے تھے، اس مقصد کے لیے ہم پل خمری سے قتدوز کے لیے روانہ ہوئے۔

پل خمری سے بغلان شہر تک سڑک اچھی حالت میں تھی، یہاں بغلان کا ایک کالج دیکھا جس کی دیوار پر افغانستان کا نقشہ بنا ہوا تھا، اس نقشے میں اردگرد کے ممالک کے نام روس، ایران وغیرہ لکھے گئے تھے مگر پاکستان کی جگہ پختونستان لکھا ہوا تھا، مجاہدین کے ہاتھوں کالج کی عمارت تباہ ہو چکی تھی اور یہ تباہی فقط اینٹوں اور پتھروں سے بنی ہوئی عمارت ہی کی نہیں تھی بلکہ اس قوم پرستانہ نظریے کی بھی تباہی تھی جسے کمیونسٹ ابھارا کرتے تھے اور پاکستان میں ان کا ایجنٹ ولی خان پختونستان کا سنٹ کھڑا کیے رکھتا تھا، آج کمیونزم اور قوم پرستی کا بت مجاہدین کے ہاتھوں پاش پاش ہو چکا تھا۔

بغلان کے بعد سڑک خراب تھی، بہر حال چھ گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم صوبہ قتدوز کے صدر مقام قتدوز شہر میں پہنچے، رات ہوٹل میں بسر کی۔ عبدالعلیم ہوٹل والے کو جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو اس نے ہماری خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کہنے لگا اتفاق سے

ہمارے گھر میں پانچ بہن بھائی، والدین اور بہن بھائیوں کی اولاد موجود تھی کہ گھر میں روپیہ کم اور میرے خاندان کا کوئی ایک فرد بھی سوائے میرے بچ نہ سکا، میں اس وقت گھر میں موجود نہ تھا، اب میں نے شادی کی ہے اور میری دو بیٹیاں ہیں۔

سر سبز و شاداب جنگل میں:

قندوز سے ہم صبح چھ بجے روانہ ہوئے، تاجکستان کی طرف جانے والی سڑک پر ہماری گاڑی رواں دواں تھی، انغان ہم سفروں سے تعارف کے بعد گفتگو شروع ہو گئی، دوران گفتگو عرب بھائیوں کا تذکرہ چھڑا تو وہابیت زیر بحث آگئی۔ چنانچہ وہ کہنے لگے کہ وہابی تو تیسری، پانچویں اور ساتویں بیٹی سے شادی کرتے ہیں، سوتیلی ماں سے شادی کر لیتے ہیں، یہ سن کر ہم نے کہا بھئی! جو وہابی ہمارے پاکستان میں ہیں وہ تو ایسا نہیں کرتے، نہ ہی عرب وہابی ایسا کرتے ہیں اور کنٹرول میں ہم نے شیخ جمیل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ہے ان کے ساتھی بھی ایسا نہیں کرتے..... اب مزاروں کی بات چھڑ گئی تو میرے ساتھی نے اس مسئلے پر بھی انھیں قرآن و حدیث کی روشنی میں تفصیل سے سمجھایا تو وہ کافی حد تک تامل ہو چکے تھے۔

پل خمری سے قندوز تک بھی علاقہ میدانی ہے کہ پہاڑ کم ہی دکھائی دیتے ہیں مگر قندوز سے دریائے آمو کی طرف چلتے ہوئے تو پہاڑ دکھائی ہی نہ دیتے تھے تا حدنگاہ سر سبز و شاداب دشت ہی دشت تھا، بھیڑوں کے بے شمار ریوڑ تھے اور ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے تھے جو سر سبز و شاداب دشت میں چر رہے تھے، سڑک بھی اچھی حالت میں تھی اور یہ اس لیے اچھی حالت میں تھی کہ اس دشت میں روسیوں کا قیام تھا اور وہ اسی سڑک سے تاجکستان واپس بھاگے تھے بہر حال گھنٹہ بھر اس دشت میں چلنے کے بعد اچانک ہماری گاڑی سڑک سے اتر کر کچے راستے پر دشت میں چلنے لگی، کچھ دیر بعد گندم کے کھیت تھے، آڑو اور زیتون کے باغات تھے، مالے تھے جو ان کھیتوں میں بہ رہے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہم صوبہ قندوز کے ضلعی صدر مقام ”امام صاحب“ میں تھے۔

حضرت حسینؑ کے مزار پر:

ہمیں معلوم ہوا کہ اس شہر میں حضرت حسینؑ کا مزار ہے اور اسی کی مناسبت سے شہر کا نام بھی ”امام صاحب“ ہے۔ چنانچہ ہم نانگے پر بیٹھ کر شہر سے ذرا باہر مزار پر پہنچ گئے، میں نے لوگوں سے پوچھا کہ حضرت حسینؑ کربلا میں شہید ہوئے اور وہیں ان کی قبر بھی ہے، یہاں ان کا مزار کیسے بن گیا؟ تو جواب ملا کہ وہاں ان کا دھڑ جبکہ یہاں ان کا سر مدفون ہے۔ یاد رہے افغانستان کے بزرگوں کی زیارتیں ہمارے پاکستان کی طرح ٹھاٹھ باٹھ والی نہیں ہیں بلکہ افغان علاقوں کی طرح وہ بھی پسماندہ ہی ہیں، بس ایک قبر پر رنگ برنگی ناکیوں اور چیتھروں کے جھنڈے گاڑ دیے، یہی بزرگ کی زیارت ہوتی ہے، کوئی بڑی زیارت ہوئی تو اس پر ایک کچا سا کمرابنا دیا اور جو بڑی زیارتیں ہیں وہ تو میرے خیال میں دو ہی ہیں، ایک مزار شریف میں حضرت علیؑ والی اور دوسری ان کے بیٹے حضرت حسینؑ کی امام صاحب والی۔ ان میں بھی باپ کی زیارت سب سے بڑی ہے اور بیٹے کی چھوٹی ہے۔

اتفاق دیکھیے کہ روسی افغانستان میں دو راستوں سے آتے ہیں، ایک ازبکستان میں مزار شریف کے راستے اور دوسرے تاجکستان سے امام صاحب کے راستے، مگر دونوں راستوں سے یہ زیارتیں افغان عوام کو بچا نہ سکیں، نہ ان پر ظلم و ستم کو روک سکیں اور نہ دہریت کے سیلاب کو تھام سکیں حالانکہ یہ مین ماکوں پر موجود تھیں۔

حضرت علیؑ کی زیارت کے بارے میں نے لوگوں سے پوچھا کہ آپ کی قبر تو ملک عراق کے شہر نجف میں ہے تو یہاں حضرت علیؑ کا مزار کیسے بن گیا؟ تو جس سے بھی پوچھا جواب میں یہ حکایت سننے کو ملی کہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد آپ کا جسد خاکی ایک اونٹنی پر رکھ دیا گیا اور اسے جنگل میں ہانک دیا گیا کہ جہاں وہ بیٹھے گی وہیں ان کی قبر بنا دی جائے گی، چنانچہ وہ یہاں مزار شریف آگئی اور یہاں ان کا مزار بن گیا۔ میں نے پوچھا پھر نجف میں کون مدفون ہے؟ تو جواب بہر حال یہی ملتا تھا کہ اصل مدفن یہیں مزار شریف میں ہے۔

بہر حال عملی طور پر حضرت علیؑ کے دو مزار اور ان کے لخت جگر، نواسہ رسولؐ حضرت حسینؑ کے جسم کے دو حصوں کے الگ الگ مزار بنے ہوئے ہیں۔ حضرت حسینؑ کے اس مزار کے بارے میں ماسوائے کچی باتوں کے کوئی ٹھوس تاریخی حقیقت نہیں ہے جبکہ حضرت علیؑ کے بارے میں تو بات واضح ہے کہ ایک شخص کے دو مزار کیسے ہو سکتے ہیں؟ مگر یہ قبر پرستی کا وہ چلن اور وہ مرض ہے کہ جو آج امت مسلمہ کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر چکا ہے اور یہ اسی شرکیہ مرض کا مایخو لیا ہے کہ جس میں بتلا قوم ایک شخص کے دو دو مزار تعمیر کر رہی ہے اور بعض بزرگوں کے تو دو سے بھی زیادہ ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اب کئی بزرگوں کی پگڑیوں، لائٹیوں اور دیگر چیزوں کے بھی مزار بننے لگ گئے ہیں۔ ایسا ہی ایک مزار فیصل آباد میں بھی ہے، جسے امام جلوی کہا جاتا ہے مگر اس مزار میں کہ جہاں کروڑوں روپیہ خرچ کر دیا گیا ہے وہاں امام جلوی مدفون نہیں بلکہ جلوی نامی کسی شخص کا عصا اور پگڑی مدفون ہے۔

قارئین کرام! حضرت علیؑ و اماد رسولؐ تھے تو حضرت حسینؑ نواسہ رسولؐ تھے، شرف صحابیت کے حامل تھے اور حضرت علیؑ تو جزیرۃ العرب میں تمام مورتیوں اور پختہ و بلند قبروں کو ڈھانے والے عظیم موحد اور مجاہد تھے..... مگر آج شرک میں بتلا لوگوں نے ان پاک باز ہستیوں کے ناموں پر، ان کے مزاروں پر اپنا شرکیہ کاروبار سجا رکھا ہے۔ مگر اللہ نے عراق کو امریکہ سے برباد کروا دیا۔ حضرت علیؑ، حضرت حسینؑ اور پیر بغداد عبدالقادر جیلانیؒ کے مزارات کو نقصان پہنچا کر لوگوں کو بتلا دیا کہ جنھیں تم پوجتے ہو وہ تو اپنے مزاروں کی حفاظت سے بھی قاصر ہیں، افغانستان میں روسیوں کو روکنے سے قاصر تھے..... تو پھر اب ان کی پوجا سے باز آ جاؤ۔

آگاہ ہو جاؤ کہ وہ نیک لوگ یعنی حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ جیسی بزرگزیدہ اور شہید ہستیاں اپنے اللہ کے پاس جنت کی ابدی بہاروں سے لطف اندوز ہو رہی ہیں، اپنے

رب کے ہاں زندہ ہیں مگر تمہاری مدد کرنے سے بے بس اور تمہاری پکاروں سے بے خبر ہیں، تمہارے شرک سے وہ لاعلم اور بری ہیں۔

بہر حال ہم مزار کے اندر گئے، وہاں ایک گدی نشین بیٹھا تھا، زیارت کرنے والے اس کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے تھے، وہ قرآن کی چند آیات پڑھتا پھر لوگ اٹھائے ہوئے ہاتھ چہرے پر پھیرتے، گدی نشین کو پیسے دیتے، قبر کو چھوتے اور واپس چل دیتے..... یعنی جس طرح کا شرک اپنی آخری حدوں کو پھلانگتے ہوئے برصغیر میں دکھائی دیتا ہے اس درجے کا شرک افغانستان میں بہر حال مجھے دکھائی نہیں دیا۔

ننگے بابے کی درگاہ پر:

واپسی پر مجاہدین کا ایک ٹرک کھڑا تھا، ہم اس میں سوار ہو گئے اور واپس شہر میں آ گئے۔ یہاں ایک بابا تھا، اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چالیس سال سے ایک ہی جگہ بیٹھا ہے، بالکل ننگا ہے، نہ وہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ ہی حاجت ضرور یہ کرتا ہے۔ چنانچہ ٹرک وہیں جا کر کھڑا ہوا اور ہم اسے دیکھنے کے لیے چلے گئے، پندرہ بیس افغانی بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ہم نے اسے دیکھ کر پشتو، فارسی اور اردو میں یہاں موجود لوگوں کو سمجھانا شروع کر دیا کہ اس کے نہ کھانے پینے کی بات محض فراڈ ہے، یہ قضاے حاجت بھی ضرور کرتا ہے۔ اس قسم کی باتوں کا مقصد تو اس بزرگ کو سوائے مشکل کشا، حاجت روا اور مانوق الفطرت ہستی ثابت کرنے کے اور کچھ نہیں ہے نا..... تو عیسائیوں نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور ان کی ماں حضرت مریم کو مشکل کشا بنا کر پیش کیا تو اللہ نے ان کے دعوؤں کو یہ کہہ کر قرآن میں رد کیا:

(النساء: ۷۵)

كَاْنَا يَاكُلَانِ اَنْطَعَامًا

”وہ دونوں تو کھانا کھاتے تھے۔“

اور جو کھاتا ہو وہ مشکل کشا اور حاجت روا نہیں ہو سکتا اور یہ بھی کہ جو کھائے گا تو وہ حاجت ضرور یہ بھی کرے گا..... تو جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم صدیقہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں وضاحتیں کر کے لوگوں کی غلط فہمیاں دور کر رہے ہیں تو یہ بابا بے چارہ کیا شے ہے..... حقیقت یہ ہے کہ یہ تو بے چارہ پاگل ہے، اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے، نہ جانے یہ کون سی مصیبت میں پھنسا ہے، اس کا تو علاج کروانا چاہیے، مگر ہم لوگوں نے اس پاگل کو مشکل کشا سمجھ رکھا ہے..... چنانچہ اس پر دونو جوانوں نے اعتراضات کیے، ان کے اعتراضات کے بھی جواب دیے گئے۔ لوگ ہمارے اس وعظ و تبلیغ سے بھد اللہ بڑے متاثر تھے، وہابیت کا کوئی الزام ہم پر نہ لگا تھا۔ چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ جب حکمت کے ساتھ حق بیان کیا جائے تو وہ بہر حال اپنا اثر چھوڑتا ہے اور مخالفین کا پروپیگنڈا اسی وقت تک مؤثر ہوتا ہے جب تک وہ ایک طرف رہتا ہے۔ جب قرآن وحدیث کا نور وہاں پہنچتا ہے اور حق اپنے دلائل کے ساتھ میدان میں آتا ہے تو پھر صورتحال کچھ اس طرح سے ہو جاتی ہے:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ﴿۱۸﴾ (الانباء: ۱۸)

”بلکہ ہم حق کے ذریعہ باطل پر ایسی ضرب لگاتے ہیں کہ وہ اس کے سر کا بھر کس نکال دیتا ہے جس سے باطل برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔“

قارئین کرام! جب برہنہ بابے نے یہ صورتحال دیکھی تو وہ غضبناک ہو کر افغانی فارسی میں ”برو، برو“ (یہاں سے دفعہ ہو جاؤ) کہنے لگا۔ چنانچہ ہم وہاں سے چل دیے یہ کہہ کر کہ بے چارہ قابل رحم ہے اور پاگل ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو شیطان کا مارا ہوا ہے..... بابا بس یہ الفاظ ہی کہہ سکا، ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکا، اس وقت ہماری عملی کیفیت قرآن کے الفاظ میں کچھ اس طرح تھی:

قُلْ أَعْبُدُوا رَبَّ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا

(الشورى: ۲۲)



”کیا تم اللہ کے علاوہ ان کی پوجا کرتے ہو جو تمہارے برے کے مالک ہیں اور نہ بھلے کے۔“

دشت ارچی کی طرف کوچ:

وعظ و تبلیغ کے بعد دوپہر ہو چکی تھی چنانچہ ہونٹل سے دوپہر کا کھانا کھلایا اور دشت ارچی جانے کے لیے سواری تلاش کرنے لگے مگر وہ نہ ملی، آخر کار ایک روسی ٹریکٹر اس طرف کو جا رہا تھا چنانچہ ٹرائی پر بیٹھ گئے کہ چلو آدھا سفر اس پر کرتے ہیں باقی پیدل کر لیں گے۔ چنانچہ دو گھنٹے چلنے کے بعد ٹریکٹر نے اپنی راہ لی اور ہم پیدل چلنے لگے۔ ٹرائی میں سوار جب لوگوں کو پتا چلا کہ ہم پاکستانی ہیں تو ہر شخص کی خواہش تھی کہ ہم اس کے مہمان بنیں مگر ہم نے سب سے معذرت کی اور منزل کی طرف چل دیے۔

چودہ پندرہ سال کا ایک افغانی لڑکا جو کہ کراچی میں مزدوری کرتا تھا، دو سال بعد واپس آیا تھا اور اب وہ اپنی ماں کے ہمراہ اپنے وطن جا رہا تھا، ان کے پاس کافی سارا سامان تھا جسے وہ اٹھانے سے قاصر تھے۔ آخر کار یہ سامان ہم دونوں ساتھیوں نے مل کر اٹھایا مگر سفر لمبا تھا، ہم بھی تھک گئے، اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ سامنے سے ایک گدھے والا آ رہا تھا، اسے تین ہزار افغانی پر ہم نے راضی کر لیا، سارا سامان گدھے پر رکھا اور چلنے لگے۔ دو گھنٹے پیدل چلے ہوں گے کہ اس لڑکے نور اللہ کا گاؤں ”ملاخلی“ آ گیا، اس گاؤں کے بائیں جانب دریائے آمو کے کنارے تاجکستان کے پہاڑ اور وہاں مکانوں پر ٹین کی چمکتی چھتیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس گاؤں میں نور اللہ کے گھر پہنچ گئے، نماز پڑھی، چائے اور کھانے کا گھر والوں نے بڑا اصرار کیا، رات یہاں گزارنے کی بھی دعوت دی مگر ہم نے معذرت کی اور کہا کہ آپ ہمیں مولانا عزیز اللہ، مولانا عبد الباقی قومندان، عبد الحمید عابدی یا قومندان جلات خان کے پاس پہنچا دیں۔ نور اللہ ہمارے ہمراہ ہو لیا۔ اس کے دادا کو ہم نے الوداعی سلام کیا تو یہ تاجکستانی بزرگ جس کی عمر سو سال کے قریب ہوگی اور آج سے ستر سال قبل یہ

تاجکستان سے ہجرت کر کے اس وقت افغانستان آ گیا جب وہاں روسی انقلاب آیا، مگر ساٹھ سال بعد دہریت کا علمبردار یہ ذمیل (روسی) انقلاب بوڑھے تاجکستانی کا پیچھا کرتے ہوئے افغانستان میں بھی آیا تھا اور آج اس بوڑھے کی زندگی میں ہی یہ انقلاب ذمیل و خوار ہو کر افغانستان سے ہی رخصت نہیں ہوا بلکہ تاجکستان سے بھی دم دبا کر بھاگتے ہوئے اپنی موت آپ مر گیا ہے۔ اس بوڑھے بزرگ کو جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں اور بغیر کھائے پیے جارہے ہیں تو اس کی پریشانی دیدنی تھی کہ پاکستانی مسلمان..... اس دشت میں..... ہمارے گھر..... اور پھر رات گزارے بغیر..... کھانا کھائے بغیر..... یقیناً اس پریشانی کا ادراک وہی کر سکتا ہے جسے افغانوں اور عربوں کی مہمان نوازی سے واسطہ پڑا ہوا..... ہم میدانوں لوگ کیا جانیں کہ مہمان نوازی کیا ہوتی ہے۔ (الامشاء اللہ)

بہر حال ہم یہاں سے نکلے تو گاؤں میں بچوں کو معلوم ہوا کہ نور اللہ آیا ہے تو وہ دوڑتے آئے۔ نوجوان اپنے یار کو ملنے کے لیے چلے آئے، حتیٰ کہ گاؤں کی عورتوں نے بھی نور اللہ سے شفقت و مودت کا اظہار کیا۔ مجھے یہ منظر بڑا اچھا لگ رہا تھا، نور اللہ کوئی چودھری کا بیٹا نہ تھا جس کا یوں استقبال ہو رہا تھا بلکہ یہاں وہی محبت بھرا دیہاتی ماحول تھا جو کبھی نصف صدی قبل ہمارے پاکستان کے دیہات میں بھی ہوا کرتا تھا..... گاؤں کا قومندان کہ اتفاق سے اس کا نام بھی نور اللہ تھا، اسے جب معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں، ان کے مجاہد ساتھی ہیں تو انھوں نے بھی رات گزارنے کو بڑا اصرار کیا مگر ہم نہ مانے تو انھوں نے کلاشن اٹھائی، کلاشن بردار محافظ ہمراہ لیے، ہمارے بیگ اٹھائے اور ہمیں جلات خان کے ڈیرے پر پہنچانے کے لیے چل پڑے۔

روس افغانستان سے کیوں بھاگا؟ ایک سبب:

راستے میں باتیں چلتی رہیں، قومندان نور اللہ نے بتلایا کہ جب روسی فوجوں کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو مجاہدین نے فیصلہ کیا کہ روس کے اندر کارروائیاں کی جائیں۔ چنانچہ ہم کئی

دفعہ تاجکستان کے اندر گئے اور اس وقت کے روس میں جا کر جہاد کیا۔ نور اللہ کی یہ بات سن کر مجھے افغان جہاد پر جنرل ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمن کی میننگ یاد آگئی، ”فتح“ کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

”بہت پہلے روسیوں نے ابھی جنگ کی حرارت محسوس کرنا شروع نہیں کی تھی، افغان سیل کے ایک اجلاس میں جنرل اختر نے کہا تھا کہ کابل میں معمول کی زندگی گزارنے والے روسی جرنیل کو جب تک ہر اسماں اور خوف زدہ نہیں کیا جائے گا وہ پسپائی پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ اب ایک اجلاس میں انھوں نے یہ کہا کہ اگر سرحد پار سے روسی افغانستان میں داخل ہو سکتے ہیں تو افغان مجاہدین کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ دریائے آمو کے اس طرف مختصر سی کارروائی کر ڈالیں، اس اجلاس میں دوسروں کے علاوہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان بھی موجود تھے، چیختے ہوئے انھوں نے کہا اس طرح تو آپ لوگ پاکستان کو برباد کر ڈالیں گے..... یہ الگ بات ہے کہ جب ایسا ہوا تو کورباچوف نے اپنے ملک میں افغانستان سے واپسی کے لیے اس کارروائی کو ایک دلیل کے طور پر استعمال کیا۔“

قارئین کرام! روسی افغانستان سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اس کے لیے جہاں دیگر بہت سے اسباب تھے وہاں ایک بڑا سبب روس کے اندر جہادی کارروائی تھی کہ جس سے بوکھلا کر کورباچوف نے واپسی کا اعلان کر دیا اور ہمارے لیے خوشی کی بات تو یہ تھی کہ آج ہم ان قومندانوں اور مجاہدوں سے جہاد کی وہ ایمان افروز باتیں سن رہے تھے، ان کارروائیوں کو ملاحظہ کر رہے تھے کہ جو روس کے پیٹ میں گھس گئیں..... ان کارروائیوں نے تو تبوک کی وہ یادیں تازہ کر دیں کہ جب اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے کی سپر پاور سلطنت روم کی فوجیں مسلمانوں پر چڑھائی کرنے کے لیے مدینے کا رخ کرنے لگیں تو اللہ کے رسول ﷺ نے اس سپر پاور کو سبق سکھانے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر اس وقت تیار کیا جب سخت گرمیوں کا موسم

تھا اور ادھر مدینے کے پھل اور فصل پک کر تیار ہو چکی تھی، اقتصادی حالت بھی دگرگوں تھی، مدینے میں منافقین بھی موجود تھے۔ یعنی حالت یہ تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ سپر پاور سے مقابلہ کے لیے مدینے سے باہر نکل کر اقدام نہ کریں تو تب بھی رومیوں کے حملہ آور ہونے کا خطرہ اور اگر مدینے سے باہر نکلیں تو منافقوں کی شرارتوں کا خطرہ۔ غرض مدینے کی ریاست ہر طرف سے خطرے ہی خطرے میں تھی..... مگر اللہ کے رسول ﷺ نے ان عسرتوں اور تنگیوں کے باوجود اسلامی فوج کو تیار کیا اور تقریباً بارہ سو کلومیٹر کا سفر کرنے کے بعد تبوک کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اب رومیوں کو معلوم ہوا کہ محمد ﷺ تو تیار کر کے اپنے لشکر سمیت ہم سے مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے گھر کے دروازے پر پہنچا چاہتے ہیں، نہ معلوم وہ کس قدر عسکری قوت کے مالک ہیں کہ جو اتنی دور تک ہم سے مقابلہ کے لیے آئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت کی سپر پاور اس رعب تلے دب کر پسپا ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے دور میں اس کا نام و نشان مٹ گیا۔

عسا کر صحابہ کے عظیم سالار، جرنیل اعظم، امام المجاہدین، امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی دشمنوں پر دفاع کی بجائے اقدام کرنے کی اس سنت کا احیاء آج میں افغان کمانڈر سے سن رہا تھا، ایک نظر کلاشن بردار مجاہدوں کو دیکھتا اور دوسری نظر سامنے دکھائی دیتا دریائے آمو سے پار تا جکستان کا پہاڑ دیکھتا اور پھولے نہ سنا تا تھا کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کے طریقے پر چلنے کی برکت سے آج مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ (الحمد للہ)

قومندان جلات خان کے مہمان:

ڈیرا گھنبرہ چلنے کے بعد اب جلات خان کا گھر سامنے تھا، ان کا بھائی اور دیگر مجاہد ساتھی کہیں جا رہے تھے، جب انھیں نور اللہ نے بتلایا کہ یہ تمہارے پاکستانی مہمان ہیں تو وہ اپنے سارے پروگرام چھوڑ کر ہمیں گھر لے آئے، ابھی بیٹھے ہی تھے کہ کھانا آ گیا، تہوہ پیش ہوا اور پھر وہی اپنا من پسند عنوان اور موضوع جہاد کی باتیں..... قتال کی یادیں۔

دشت ارچی کا یہ سارا علاقہ میدانی ہے، قریب قریب کوئی پہاڑ نہیں، گندم کے کھیت، درخت اور خود رورنگ برنگے پھول کہ یہاں اب بہار کا موسم آیا ہے..... اور بہار کے موسم میں ہی ۱۴ سال بعد فتح کی بہار بھی دیکھنے کو ملی ہے اور ہم اس بہار میں گلستان جہاد کے پھول مجلۃ الدعوة کے قارئین کے لیے چن رہے تھے۔

اس گلستان جہاد و قتال کے ایک پھول گل آغا نے کہا کہ سرحد پر ہونے کی وجہ سے ہمارے یہاں روسیوں کی بمباری بڑی شدید ہوتی تھی پھر علاقہ بھی میدانی اور اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان سے یہاں خوراک، اسلحہ اور ادویہ وغیرہ کے لیے ایک ایک ماہ کی مسافت درکار ہوتی تھی کہ جس کی دشواری ناقابل بیان ہے۔ چنانچہ ہم میں سے جب کوئی تھوڑا بہت زخمی ہوتا تو اس کا خود ہی علاج کر لیتے اور جب کوئی زیادہ زخمی ہو جاتا تو ہم اس کا سر مونڈھ دیتے اور بزرگوں کے ہاتھ روسی ہسپتال میں پہنچا دیتے۔ وہ بزرگ روسیوں سے کہتے کہ یہ مجاہد نہیں ہے، گھر میں ہی بمباری سے زخمی ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب یہ زخمی مجاہد اور غازی صبح ہو جاتا تو دوبارہ جہاد شروع کر دیتا..... مگر انھیں اگر پتا چل جاتا کہ یہ تو مجاہد ہے تو اسے زہر کا ٹیکہ لگا کر شہید کر دیتے۔

جہاد افغانستان میں عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا بھی ایک کردار ہے، وہ خلقی کمیونسٹوں سے اشیائے ضرورت خریدتے اور پھر مجاہد ان سے خرید لیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی بوڑھا بھی بدل کر کمیونسٹوں کے اندر گھومتا پھرتا اور پھر اچانک موقع پا کر فائر کرتا اور بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس سے کمیونسٹ پریشان ہو جاتے کہ یہ ہمارے اندر سے کون تھا جو یوں کارروائی کر کے بھاگ اٹھا۔

گدھے پر سفر:

رات کھانا کھانے کے بعد دیر تک گفتگو کرتے رہے، صبح بیدار ہوئے اور قومندان عبدالحمید عابدی کی قرار گاہ کی طرف چل دیے۔ طاہر خان گدھا اور کلاشکوف لے کر ہمارے

ہمراہ ہولیا۔ ہم دونوں باری باری گدھے پر بیٹھتے رہے، اڑھائی تین گھنٹے یوں سفر کرنے کے بعد طاہر خان ایک ڈیرے پر رک گیا اور کہنے لگا کہ یہاں اب ناشتہ کر لیں پھر آگے چلیں گے۔ چنانچہ اس نے ڈیرے کے مالک آدم خان کو آواز دی، آدم خان باہر آیا، طاہر خان نے اسے بتلایا کہ یہ ہمارے پاکستانی مجاہد ہیں، یہ سنتے ہی آدم خان نے اپنے مزارع کو تالین لانے کا کہا اور وہ اندر سے تالین اٹھا لایا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی، صبح بھی ہلکی ہلکی پھوار تھی، اب تھم چکی تھی، باہر کا موسم بڑا خوشگوار تھا، آدم خان نے یہیں ایک بڑے درخت کے نیچے تالین بچھا دیا۔ ہم نے کہا کہ کچھ پر تالین بچھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تو آدم خان کہنے لگا آپ جیسے مہمان اور یہ تالین کیا چیز ہے..... بہر حال تکیے لگ گئے اور ہم تالین پر بیٹھ گئے۔

فوراً گائے کا دودھ آگیا، تہوہ تو تھا ہی افغانی روٹیاں بھی دسترخوان پر سج گئیں۔ چنانچہ ناشتہ شروع ہو گیا، چار سالہ معصوم سا خوبصورت بچہ قریب آ کر بیٹھ گیا، میں نے آدم خان سے پوچھا یہ آپ کا بیٹا ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا پھر وضاحت کرنے لگا کہ یہ محمد خان کا بیٹا ہے جو روسیوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گیا، اس کے بعد میں نے شہید کی بیوہ سے شادی کر لی، یہ میری دوسری بیوی ہے جبکہ پہلی سے بھی میری اولاد موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ افغان قوم بڑی غیور قوم ہے، ایسی قوم کہ جس کے سترہ لاکھ افراد جنگ کی نذر ہو گئے جبکہ زخمیوں اور معذروں کا کوئی شمار نہیں، مگر غور کیجیے کہ افغان بیواؤں کا اس قوم نے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیا اور وہ مسئلہ اسی لیے پیدا نہیں ہوا کہ افغانوں نے دودو، تین تین اور چار چار شادیاں کر لیں۔ تعدد ازدواج کے قرآنی حکم کی حکمت یہاں بخوبی سمجھ آتی ہے، وگرنہ جنگ عظیم کے بعد سارا یورپ ایسی اخلاقی بے راہ روی اور بد کرداری کا شکار ہوا کہ جسے دیکھ کر شیطان آج بھی شرما اٹھتا ہے۔ چنانچہ افغان معاشرے کا یہ اسلامی پہلو بھی عربوں کی طرح ایسا تباہ کن ہے کہ جسے دیکھ کر دل بے اختیار بول اٹھتا ہے کہ زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے کہ جہاں ہمارے رب کی راہ نمائی موجود نہیں ہے۔

محمد خان کے اس یتیم بچے کا نام صد خان تھا، دنیا و ما فیہا سے بے نیاز ہو کر ”کوفیہ“ چلا رہا تھا، دس بارہ سال کا جب ہوگا تو کلاشنکوف تھام لے گا، اسے جب معلوم ہوگا کہ میرے باپ کو روسیوں نے شہید کیا تو اس کا دل آخر ماسکو تک روسیوں کا پیچھا کرنے کو کیوں نہ چاہے گا۔ میرے ہم سفر ساتھی کو بادام بڑے پسند تھے، چنانچہ انھوں نے جیکٹ کی جیب سے بادام نکالے اور صد خان کو دے دیے، اس کی جیب میں افغانی کرنسی ڈالی، جی بھر کر اسے پیار کیا کہ یہ ایک شہید کا بیٹا تھا۔

ایک سوال کے جواب میں آدم خان نے بتلایا کہ اس کے ماں باپ اور ایک بھائی بھی اللہ کے راستے میں شہید ہوئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ افغان قوم جو جہاد میں کود پڑی اس کے ملک افغانستان میں شاید ہی ایسا کوئی گھر ہو کہ جس میں ایک بھی شہید نہ ہو ہو یعنی ایک نہ ایک تو بہر صورت ہے جبکہ دودو، تین تین اور چار پانچ تک تو عام ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس گھرانے کا ایک فرد بھی شہید نہیں ہو اس گھر کو افغانستان میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔

ناشتہ کر کے چلے تو ڈیرا گھنٹہ بعد ہم قومندان صاحب کی قراگاہ پر تھے، جلات خان جو اپنے گھر میں موجود نہ تھے، وہ بھی یہیں تھے۔ چنانچہ دونوں قومندانوں سے ملاقات ہو گئی، کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ہم نے مولانا عبدالباقی صاحب کی قراگاہ پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ایک کلاشن بردار مجاہد کو ہمارے ہمراہ کر دیا گیا اور گھنٹہ بھر سفر کرنے کے بعد ہم سلیفوں کی قراگاہ پر تھے۔

سلفی مجاہد مولانا عزیز اللہ شہید کی قراگاہ پر:

روسی سرحد پر واقع دشت ارچی جو کہ دریائے آمو کے کنارے صوبہ قندوز کا ضلع بھی ہے، ہم اس کی ہستی باجوڑی میں پہنچے، یہی مولوی عزیز اللہ کا گاؤں ہے، اس گاؤں کے جس گھر میں ہم پہنچے یہ گھر تو مولوی عزیز اللہ ہی کا ہے مگر مجاہدین کی قراگاہ ہے۔ کابل سے ہمیں

مولوی عبدالحکیم بر اور مولوی عزیز اللہ نے اپنے بھائی کے نام خط دیا تھا مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ تو عرصہ دو سال سے شہید ہو چکے ہیں مگر دوریاں اس قدر تھیں کہ ہنوز مولوی عزیز اللہ کی شہادت سے اس کا بھائی بھی بے خبر تھا اور باقی احباب بھی۔

ہم قراگاہ میں پہنچے تو مولانا عبدالباقی جو کہ جماعت الدعوة الی القرآن والسنۃ کی طرف سے مجاہدین کی قراگاہ کے قومندان تھے، انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ یہ مولانا عزیز اللہ کے ماموں ہیں اور اب اپنے بھانجے کے جانشین ہیں۔ جب ہم پہنچے تو دوپہر کا دسترخوان بچھ چکا تھا، ہم بھی شامل ہو گئے اور ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولوی عزیز اللہ جو کہ جمیل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت سے وابستہ تھے، انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اس علاقے میں دعوت و جہاد کا کام شروع کیا اور اس قدر تیزی، لگن اور محنت سے کام شروع کیا کہ جہاد میں قراگاہ اور جہہ بنایا، دعوت کا کام کر کے لوگوں کے عقائد کو سنوارا اور پھر انھیں مجاہد بنایا۔ ان کا یہ کام کمیونسٹوں کو مطلق نہ بھایا۔ چنانچہ ان کے قتل کے پروگرام بننے لگے حتیٰ کہ انغان جاسوس ادارے خاد نے اس شخص کے لیے ۶۰ لاکھ انغانی کرنسی کا انعام مقرر کیا جو مولوی صاحب کو قتل کرے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس علاقے کا ایک شخص صوفی اسماعیل جو کہ مولوی صاحب کی دعوت کا دشمن تھا، وہ اپنے مقصد کے لیے کمیونسٹ بن گیا اور دو سال قبل جبکہ مولوی صاحب عید انظر کی نماز پر بھا کر واپس جا رہے تھے، کلاشکوف کے برسٹوں سے ان پر حملہ کر دیا گیا۔ چنانچہ مولوی صاحب، ان کے چار ساتھی قومندان مومن خان، ہارون خان، یعقوب خان اور بدخشاں کے ایک سلفی قاری شہید ہو گئے۔

مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالحمید نے بتلایا کہ جب بھائی جان شہید ہوئے تو احمد شاہ مسعود ان دنوں اسی علاقے میں کہیں موجود تھے، انھوں نے مولوی صاحب کی شہادت پر کہا تھا کہ جب حالات سازگار ہوئے تو مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کا

بدلہ لوں گا۔

مولوی صاحب کے گاؤں باجوڑی میں سے جب ہم گزرے تو باقی دیہات کی طرح اس کا بھی کوئی ایک گھر بھی سلامت نہ تھا، چھتوں کے بغیر دیواریں موجود تھیں، مکیں غائب تھے۔ مولوی صاحب کا گھر مجاہدین کی قراگاہ ہے، جس کا نام ”انجم“ ہے۔ دعوت و توحید کا یہ ستارہ آج بھی جگمگا رہا ہے، دشمن اپنے مقاصد میں ناکام ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، وہ تو سرخرو ہوئے (ان شاء اللہ) جبکہ دنیا میں بھی ان کا لگایا ہوا پودا بار آور ہو رہا ہے۔ مولوی صاحب کی مسجد بھی دیکھی جہاں وہ خطبہ جمعہ دیا کرتے تھے، یہ مسجد آج بھی آباد ہے اس کی داہنی دیوار کے ساتھ وہ مورچہ آج بھی موجود ہے جہاں مولوی عزیز اللہ کمیونسٹوں کے خلاف مورچہ زن ہوا کرتا تھا۔ مسجد اور مورچے کا یہ حسین امتزاج دل کو بڑا ہی بھا رہا تھا، بہار کا موسم تھا، ہر طرف قدرتی پھول ہی پھول تھے، مسجد کے سامنے شہداء کا قبرستان تھا، یہیں مولوی صاحب کی قبر تھی، مجاہدین نے ہماری راہ نمائی کی، وہاں جا کر فاتحہ پڑھی، کیونکہ خود رو پھول اس قدر تھے کہ یہاں کوئی قبرستان اور قبر کا وجود تو معلوم ہی نہ ہوتا تھا۔

مولوی صاحب جب شہید ہوئے تو اڑھائی سو آدمی جماعت الدعوة سے منسلک ہو چکے تھے۔ جب ہم قراگاہ میں گئے تو دسترخوان پر بیس کے قریب مجاہد موجود تھے۔ مولانا عبدالباقی نے ہمیں شیخ ولی اللہ کے لیے رقعہ دیا اور پھر ہم نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ بڑے اصرار کے ساتھ رات گزارے بغیر جب ہم رخصت ہوئے تو ہمیں روسی ٹریکٹر اور ٹرائی دی گئی کہ اس دشت میں سفر کے لیے یہ سواری لینڈ کروزر سے کم نہیں..... تین سلفی مجاہد ہمارے ہمراہ تھے، پانچ گھنٹے کے بعد ہم ”امام صاحب“ واپس پہنچ چکے تھے۔ راستے میں ایک قراگاہ پر سلفی کمانڈر نظام الدین سے ملاقات کی، خواجہ غار کا سلفی نوجوان ذبیح اللہ بھی تپاک سے ملا۔

قندوز کے سب سے بڑے کمانڈر سے ملاقات:

صبح اٹھے تو بائیس ہزار افغانی کرنسی پر کرائے کی جیب پکڑی اور کمانڈر صاحب کی ملاقات کو روانہ ہوئے۔ ڈرائیور نے سیدھے راستے کے بجائے مختصر راستہ اپنایا اور صحرا نما دشت میں جیب دوڑاتے ہوئے کوئی ایک گھنٹے بعد مین روڈ پر پہنچا۔ یہاں ہم ایک بستی میں اس صوبے کے سب سے بڑے کمانڈر مولوی عبداللطیف سے ملاقات کرنے کی قرار گاہ میں گئے۔ قرار گاہ کے باہر جیپیں، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ قرار گاہ سے باہر کلاشن بردار مجاہدین کا گروپ کھڑا تھا، ہم نے انھیں اپنا تعارف کروایا اور کمانڈر سے ملاقات کے لیے کہا، ہمیں استقبالیہ کمرے میں بٹھانے کے تھوڑی دیر بعد ہی مولوی صاحب کا ملاقات کے لیے پیغام آگیا۔ چنانچہ ہم گئے تو کمانڈر مولوی عبداللطیف ابراہیمی امیر جہاد قندوز و حدود روس حاجی عبدالرؤف ابراہیمی امیر نظامت حدود روس اور استاذ طارق امیر امور سیاسی صوبہ قندوز و حدود روس نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ تعارف کے بعد گفتگو شروع ہوئی، پندرہ بیس منٹ بات چیت جاری رہی۔ اس بات چیت میں جو سب سے زیادہ اہم اور خوش کن بات تھی وہ یہ کہ مولوی صاحب نے بتلایا کہ ہم الحمد للہ روس کے اندر جا کر کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔ میں نے پوچھا اب تو یہ کارروائیاں نہیں ہوتی ہوں گی؟ کیونکہ تاجکستان جو کبھی روس کا حصہ ہوا کرتا تھا آج وہ آزاد ہے۔ تو تقریباً میرے ہم عمر نوجوان امیر جہاد نے کہا وہاں اب بھی پوسٹوں پر روسیوں کا کنٹرول ہے اور جو باقی حکام ہیں وہ بھی وہی پرانے کمیونسٹ ہیں کہ جن کے ذہن، نظریات اور عادات و اطوار وہی ہیں یعنی وہ نجیب جیسے ہیں..... چنانچہ ہمارا جہاد جو روسیوں کے وقت سے ہم نے شروع کر رکھا ہے، وہ جاری ہے، یہ کبھی ختم نہ ہوگا اور ابھی حال ہی میں ہم دو تاجکستانی گروپوں کو تاجکستان کے اندر بھیج چکے ہیں، ان میں سے ایک گروپ تیرہ جب کہ دوسرا پچاس افراد پر مشتمل تھا، انھیں ہم نے یہاں ٹریننگ دی ہے اور دریائے آمو کے پار بھیجا ہے۔

گفتگو کے آخر پر میں نے دریائے آمو دیکھنے کی خواہش کی تو کمانڈر نے ایک کلاشن بردار مجاہد ہمارے ساتھ روانہ کیا، گاڑی کا پوچھا تو ہم نے کہا کہ گاڑی ہمارے پاس موجود ہے، چنانچہ گاڑی تک انھوں نے ہمیں الوداع کیا اور ہم دریائے آمو کی طرف چل دیے۔

دریائے آمو کے کنارے بندر شیرخان میں:

اب ہمارا رخ بندر شیرخان کی طرف تھا، راستے میں ہمیں دو تین جگہ چوکیوں پر مجاہدوں نے روکا مگر جوئی انھیں ہمارا ہمراہی مجاہد آگاہ کرنا کہ یہ کمانڈر صاحب کے پاکستانی مہمان ہیں تو محبت اور تشکر بھرے جذبات سے ہمارا راستہ صاف کر دیا جاتا۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم بندر شیرخان میں تھے۔

ہم ابھی جیب سے اترنے کی تیاری کر رہے تھے کہ مجاہد نے بندر شیرخان کے کمانڈر کے پاس جا کر ہمارا تعارف کرا دیا۔ چنانچہ ہم اندر گئے تو والہانہ ملاقات کے بعد ہم اس دارالاضیافہ میں بیٹھے جہاں بڑے بڑے جرنیل کھانا کھایا کرتے تھے، صوفے اور ٹیبل سجے ہوئے، ٹالین بچھے ہوئے تھے، مجاہدین ابھی یہاں ناشتہ کر کے اٹھے ہی تھے کہ ہم پہنچے تو ہمارے لیے ناشتہ چن دیا گیا۔ ناشتہ کرتے رہے، باتیں کرتے رہے، جہاں کبھی روسی جرنیل کھانا کھاتے ہوئے پاکستان تک کو روندنے کی باتیں کیا کرتے تھے آج ہم ناشتہ کرتے ہوئے اپنے مجاہدین کے لیے ماسکو تک یلغاریں کرنے کی سوچیں سوچ رہے تھے۔ کمانڈر صاحب عربی خوب جانتے تھے اس لیے عربی میں اور کبھی درمیان میں پشتو اور فارسی میں بھی کوئی بات کر لیا کرتے۔ ناشتہ کے بعد ہم باہر نکلے تو ارد گرد اس بڑی بلڈنگ میں کئی دفاتر تھے، وسیع و عریض سرسبز لان تھا، مجاہدین کا گھوڑا اب اس لان میں گھاس چر رہا تھا۔

ایران اور افغانستان میں ”بندرگاہ“ کو صرف ”بندر“ کہتے ہیں، چنانچہ اس بندرگاہ کا نام بندر شیرخان ہے۔ اب ہمارا رخ دریائے آمو پر بنی ہوئی بندر شیرخان کی عمارت کی طرف تھا، قومندان صاحب کا گائیڈ بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ جب ہم دریا کے کنارے پہنچے تو یہ واقعی

بندر گاہ تھی جبکہ دریا میں مال بردار کشتیاں اور سامان اٹھانے والی کرینیں بھی کھڑی تھیں۔ دریا بہت بڑا تھا، گہرا اور خاموش تھا، ہمیں بتلایا گیا کہ کبھی اس دریا میں کشتیوں کے ذریعے لمبی مسافت طے ہوتی تھی، بندر شیرخان سے حیرتان و ترمذ اور اس سے آگے تک کشتیاں چلتی تھیں۔

بندر گاہ پر واقع روسیوں کی لائبریری میں بھی ہم گئے، یہاں لینن اور مارکس کی کتابیں دیکھنے کو ملیں، اللہ کے انکار پر مبنی دہریت کا لٹریچر اب زمین پر بکھرا پڑا تھا۔ افغان کمیونسٹ لیڈر بھکر کارمل اور نجیب وغیرہ کے حوالے سے بھی افغانیوں کو دہریت کا سبق دینے والا لٹریچر موجود تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے لٹریچر آتا اور پورے افغانستان میں پھیلا یا جاتا مگر اب اس سارے لٹریچر اور نظریے کا قرآن نے منہ توڑ دیا ہے۔ چنانچہ اب یہ سارا لٹریچر جمع کر کے کچھ تو دریائے آمو کی نذر کیا جائے گا اور کچھ یادگار کے طور پر باقی رہے گا تاکہ آنے والی نسلیں اس احقمانہ لٹریچر کو دیکھ کر اس کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔

لائبریری سے نکلے تو ساتھ ہی اس دفتر میں گئے جس میں بڑا روسی جرنیل بیٹھا کرتا تھا اور یہاں کے معاملات کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ اس دفتر سے نکلنے کے بعد ہم نے دریا کے کنارے تاجکستان کا نظارہ کیا، نگلی آنکھ کے ساتھ اور دور بین کے ساتھ اس سرزمین کو دیکھا کہ جو آج روسی درندوں کی زندیق کچلیوں سے تو آزاد ہو گئی ہے مگر ابھی اس کے دانتوں سے کلی طور پر خلاصی نہیں ہوئی۔

وہ اس طرح کہ مولوی عبداللطیف صاحب نے مجھے بتلایا کہ ابھی تک ترکستان یعنی ازبکستان، تاجکستان، تازقستان، کرغستان اور ترکمانستان میں اہم پوسٹوں پر روسی ہی براجمان ہیں اور جو مسلمان حکمران ہیں تو وہ بھی وہی پرانے کمیونسٹ ہیں جو سیکولرازم کے حامی حتیٰ کہ سابق نجیب اور اس کے حواریوں کے طرف دار اور مجاہدین کے مخالف ہیں کہ مجاہدین کے افغانستان میں کنٹرول حاصل کرنے سے انھیں بہر حال خطرہ ہے..... لہذا افغان جہاد کی

برکت سے یہ علاقے آزاد ہو گئے ہیں مگر وہ کامل آزادی کہ جو کبھی اس علاقے کا طرہ امتیاز
ہوا کرتی تھی تو وہ ابھی باقی ہے۔ چنانچہ اب میں بندرگاہ کے پلیٹ فارم سے نیچے اترا،
دریائے آمو کہ جسے دریائے جیجون بھی کہا جاتا ہے، اس کے پانی سے وضو کیا..... اس عزم
کے ساتھ کہ اے دریائے جیجون.....! عنقریب تیرے پانیوں سے پھر مجاہدین وضو کر کے اپنے
مالک کے حضور جھکتے اور دعائیں مانگتے ہوئے اور ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھامے تجھ سے پار
(ماواراء النہر) سمرقند و بخارا سے آگے اونا اور تازان سے اس طرف دریائے ولگا سے پار
واغستانی لشکروں کو ہمراہ لے کر ماسکو کی طرف بڑھنے والے ہیں۔

اے دریائے آمو.....! روسی تجھے پار کر کے ان دونوں راستوں سے بھاگے ہیں مگر ہم
مجاہدین روس کے تعاقب میں شاہراہ سالانگ پر حیرتان بندر سے اور شیرخان بندر سے اپنا
سفر جاری رکھیں گے۔ (ان شاء اللہ)



روس کی سیر

افغانستان سے ترکستان تک روس کے تعاقب میں:

اللہ عزوجل کی توفیق سے افغانستان میں دریائے آمو تک پہنچ گیا تھا لہذا اب ۳ اگست ۹۲ء کو سوا بارہ بجے پی آئی اے کے بوئینگ پر سوار ہوا اور پھر اپنے ہم سفر ساتھ حافظ عبدالعزیز کے ہمراہ پاکستان کے بعد افغانستان کی فضاؤں میں اڑ رہا تھا کہ پائلٹ نے کچھ یوں باخبر کیا:

”اس وقت ہم مزار شریف کے اوپر محور پرواز ہیں اور اب دریائے آمو پار کر کے ازبکستان میں داخل ہوتے ہوئے ترمذ پر اڑ رہے ہیں۔“

جی ہاں!..... ٹھیک اسی جگہ آج سے چار سال قبل روسی انونج کا سربراہ جنرل گرموف جب اپنی فوج کو افغانستان سے بھگا کر یہاں پہنچا تھا تو شاہراہ سالانگ پر مجاہدین اس کے تعاقب میں تھے، وہ اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ دریائے آمو پر افغانستان کی سرحدی چوکی ”حیرتان“ سے وہ جلدی جلدی پل عبور کر کے ترمذ میں داخل ہوا۔ وہ سراپا حیرت میں ڈوبا ہوا تھا، سوچ رہا تھا کہ روس تو جہاں گیا وہاں سے نکلا نہیں مگر اب یہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ حیرتان سے گزرتے ہوئے اس حیرت و استعجاب نے اس کی مت اس حد تک مار دی کہ اس نے جو تقریر اپنی انونج کے سامنے افغانستان میں کرنا تھی اسے وہ ترمذ میں بھی نہ کر سکا، صحافیوں کے روبرو بس وہ اتنا سا شکست خوردہ اور ذلت آمیز جملہ بول سکا:

”آج کا دن وہ دن ہے کہ جس کا ہمیں کئی سالوں سے انتظار تھا۔“

یہ دن ۱۵ فروری ۱۹۹۲ء کا دن تھا کہ گراموف یہاں یہ دن بھی گزار نہ سکا، جہاد کا خوف اسے آگے بھگالے گیا۔

آج سے بارہ سال قبل امام ترمذی کے اس شہر کے راستے قدرے آزاد ازبکستان میں جانے کا کسی کے دل میں کوئی تصور اور خیال تک نہ تھا مگر جہاد نے اسے عملی حقیقت کا روپ دے دیا اور آج اللہ نے جہاد کی برکت سے ہمارے لیے یہ ممکن بنا دیا کہ اڑھائی گھنٹے کی فلائیٹ کے ذریعے ہمیں تاشقند ایئر پورٹ پر اتار دیا گیا۔ ہوائی جہاز سے لاؤنج میں آئے تو دو گھنٹے کلیرنس میں لگ گئے، سارا عملہ روہی تھا۔ کسٹم کا طریق کار یہ تھا کہ جس کے پاس آم کی پٹی تھی اس سے تین چار آم رکھ لیے، جس کے پاس کپڑا تھا اس سے تھوڑا سا کپڑا رکھ لیا اور جس کے پاس جیکٹیں تھیں اس سے ایک جیکٹ رکھ لی۔ یعنی یہ کسٹم عملہ کیا تھا یہ تو ہمارے ہاں سبزی منڈی میں بولی دینے والوں کا ایک گروہ تھا کہ جو آڑھتیوں کی طرح سبزی اور فروٹ کی ٹوکریوں سے اپنی چونگی وصول کر رہا تھا۔

ماسکو کا سفر:

ہمارا ویزا یکم اگست سے ۱۵ اگست تک تھا اور وہ بھی صرف ازبکستان کے تین شہروں تاشقند، شمرقند اور بخارا کے لیے کہ جسے اسلام آباد کے روہی سفارت خانے نے جاری کیا تھا، پھر تین اگست کو ہم یہاں پہنچے تھے، لہذا ہمارے پاس صرف ۷ دن تھے۔ تاشقند آ کر ۲۴ گھنٹوں کے اندر ہم نے اپنے آنے کی اطلاع کرنا تھی، وہ بھی نہ کر سکے اور اپنے اللہ پر توکل کرتے ہوئے ماسکو کا پروگرام بنا لیا۔ تین دن تاشقند میں لگ گئے اور پھر دونوں جوان جو کہ عربی زبان سے آشنا تھے، ہمارے ہمراہ ہو لیے۔ ماسکو کا ٹکٹ خریدا اور سات اگست کو چھ بجے صبح ہم تاشقند سے ماسکو کی طرف روانہ ہوئے۔

ہمارا ٹکٹ درجہ دوم کا تھا اور ہم چار ساتھیوں کے لیے چار بیڈز پر مشتمل پورا کیبن ہمارے تصرف میں تھا، بستر تو پہلے ہی اوپر موجود تھے، اب صاف ستھرے سفید تولیے اور چادریں بھی فراہم کر دی گئیں، گاڑی چل پڑی اور ہم مصروف گفتگو ہو گئے۔ تب ایک روہی انسپکٹر ہمارے

پاس آیا اور ہمارے ساتھیوں سے نکت دکھانے کو کہا، انہوں نے نکت دکھائے تو کہنے لگا یہ جو غیر ملکی ہیں ان کے لیے تین گنا زیادہ پیسوں کا نکت ہوتا ہے، وہ کیوں نہیں خرید؟ ساتھیوں نے کہا ہمیں پتا نہیں تھا اور یہ نکت بھی ہم نے ہی خریدا ہے۔ اس کے بعد اس نے ہمارے پاسپورٹ اور ویزے دیکھنا شروع کر دیے، کچھ دیر دیکھنے کے بعد اس نے بغیر کوئی اعتراض کیے ہمیں ہمارے کاغذات واپس کر دیے اور چل دیا۔ ہم سمجھتے ہیں یہ خالص اللہ کا کرم تھا جو ہم پر ہوا کہ اس نے پھر نہ تین گنا وصول کیے اور نہ ہی کاغذات پر کوئی اعتراض کیا۔

گاڑی آدھا گھنٹہ چلی ہوگی کہ اب تازقستان شروع ہو گیا اور پھر متواتر دو دن تک گاڑی تازقستان میں چلتی رہی۔ یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست ہے، اس کا رقبہ انڈیا کے رقبے کے برابر ہے اور آبادی دو کروڑ کے قریب۔ تازقستان میں ہم نے کپاس کی فصلیں بھی دیکھیں اور صحرا بھی، جنگلات بھی دیکھے اور شہر بھی، مگر جو خاص شے دیکھی وہ خوبصورت عمارتیں تھیں کہ ایک بڑے سے کمرے کے چار کونوں پر مینار ہیں، درمیان میں گنبد ہے اور ایک ہی جگہ پر سو سو، دو دو سو کے قریب یہ عمارتیں، میں سمجھا کہ یہ ولیوں کے مزارات ہوں گے مگر اس قدر؟ اور پھر تازقستان میں..... اب میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا بھئی! یہ آبادیاں ہیں یا ولیوں کے مزار؟ تو وہ کہنے لگے یہ تو عام لوگوں کے قبرستان ہیں، تازقستان میں قبرستان ایسے ہی ہوتے ہیں جبکہ انھیں بنانے والے خود بے چارے کچے گھروں میں رہتے ہیں مگر کوئی مرنا ہے تو ساری پونجی اس کی قبر پر لگا دیتے ہیں۔

گاڑی میں دوسرے دن ہم ساڑھے بارہ بجے کے قریب ”اورنبرگ“ شہر میں پہنچے۔ اب ہم یورپ میں تھے، ایشیاء کی زمین ختم ہو چکی تھی، شہر کے نام سے اس پورے علاقے اور ریاست کا نام بھی ”اورنبرگ“ ہے۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ بارہ ہزار کلومیٹر مربع ہے۔ نہر ”اورال“ جو ”بشکیریا“ سے آتے ہوئے اس ریاست سے گزرتی ہے اور ”بحر خزر“ میں گرتی ہے، تو یہ ماضی میں مسلمانوں کی عظمتوں کے نشان اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ”اورنبرگ“ شہر اسی نہر کے کنارے آباد ہے۔ یہ شہر جو کبھی اسلامی تاریخ میں بڑا اہم شہر ہوا کرتا تھا آج

یہاں آدھ گھنٹہ کے لیے گاڑی رکی تو میں پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اس شہر میں گھومتا رہا مگر اب یہاں اسلامی عظمت کا کوئی نشان نہ تھا، روسیوں نے مقامی مسلمانوں کو اٹھا کر ادھر ادھر دھکیل دیا، اکثر کو قتل کر دیا اور اب یہاں روسیوں کی اکثریت ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی بشکیر، تازاق اور تاتار مسلمان کافی تعداد میں ہیں اور ان کا اسلام صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔

اگلے دن یعنی ۹ اگست کو ساڑھے تین بجے ہم ماسکو کے ریلوے سٹیشن پر تھے، ہم نے تین دن اور دو راتیں گاڑی میں گزاریں۔

گاڑی میں دوران سفر ہمارے ساتھی عبدالقدوس اور ابو الرشید دینی مسائل پوچھتے رہے، قرآن حفظ کرتے رہے اور جس قدر وہ حفظ کر لیتے میں اس کا ترجمہ اور تفسیر انھیں پڑھا دیتا۔ اسی طرح سے ہمارا سفر بھلائی بڑا بابرکت اور خوشگوار رہا۔

ماسکو میں:

جتنا عرصہ ہم نے گاڑی میں گزارا اتنا ہی ماسکو میں قیام رہا۔ ہم ریلوے سٹیشن سے میٹرو کے ذریعے جامع مسجد میں پہنچے۔ یہاں نماز ادا کرنے کے بعد ہم نے طلباء کا ہوٹل ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں پاکستانی طلباء بھی ہوں گے، ان سے ماسکو کے بارے کچھ معلومات لیں گے۔ خیر ہم شام کے وقت طلباء کے ہوٹل میں پہنچے تو وہاں مختلف ملکوں کے طلباء موجود تھے، یہ سب روسی بلاک کے ممالک کے طلباء تھے۔ یہاں کچھ نوجوان کاروبار کے لیے طالب علم بنے ہوئے تھے۔ ہمارا واسطہ ایسے ہی پاکستانی نوجوانوں سے پڑا، یہ لوگ چار سو ڈالر دے کر یہاں یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات میں داخلہ لے لیتے ہیں اور پھر کاروبار کرتے ہیں اور آگے جرمنی، فرانس وغیرہ میں جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی نیا ملک پاکستانیوں کے علم میں آئے بس پھر کیا ہے، ایجنٹ حضرات سبز باغ دکھاتے ہیں اور لوگ گھر بیچ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور سب کچھ لٹا کر گھر کا رخ کرتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال آج کل یہاں بھی موجود ہے۔

ہم انہی پاکستانیوں کے پاس ہی رات ٹھہر گئے، پھر کچھ نہ پوچھیے رات کیسی گزری۔ یہ ہوسٹل یوں تھا جیسے جنگل میں جانوروں کا مسکن ہو، شور شرابا اور ہوا کی بلند آوازیں، اور ہوتی کیوں نہ کہ لڑکوں نے شراب پی رکھی تھی، روپی لڑکیاں ان کے ہمراہ تھیں، رقص کا دور چل رہا تھا، کہیں کہیں نشے میں دھت آپس میں لڑائی جاری تھی، شراب کی بوتلیں فرش پر ٹوٹ رہی تھیں..... پچھلی رات تک یہ مشق جاری رہی اور پھر یہ لوگ سوئے تو دن کے بارہ بجے اٹھے۔ صبح کے وقت ایسے تھا جیسے یہاں کوئی آدمی موجود نہ ہو۔

غور کیجیے! یہ ہیں وہ ہاسٹل کہ جہاں کمیونسٹ ملکوں کے لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے اور واپس اپنے ملکوں میں جا کر روس کی مدد سے وہ انقلاب برپا کرتے تھے اور پھر وہ پورے ملک کو ان ہاسٹلوں جیسی رہائشوں میں بدل دیتے تھے۔ افغانستان کا ببرک کارمل، حفیظ اللہ امین اور ڈاکٹر نجیب اللہ کہ جس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تو یہاں ماسکو سے ہی اور انہی ہاسٹلوں میں رہا اور افغانستان کا صدر بن کر اس نے وہاں وہی کچھ کیا جو ان ہوسٹلوں میں وہ کیا کرتا تھا۔ اس قدر گندے ماحول میں بھی چند اللہ والے ہمیں مل گئے، عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے ہم نے وضو کا ارادہ کیا، کمرے سے باہر نکلے تو برآمدے میں یمن کا طالب علم مل گیا، سلام دعا اور عربی میں گفتگو ہوئی۔ نماز کا ذکر ہوا تو اس نے کہا ہم نے ہوسٹل میں ایک کمرے کو مسجد بنا رکھا ہے۔ اب ہم وہاں پہنچ گئے، اذان ہوئی، یمن، الجزائر اور مراکش کے عرب طلباء اکٹھے ہو گئے، مجھے آگے کر دیا گیا، میں نے نماز پڑھائی، نماز کے بعد کافی دیر اکٹھے بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ طلباء کہنے لگے یہاں تو ہر روز ایسے ہی ہوتا ہے۔ بہر حال ہمیں ہمارے ملک والوں نے بھیجا ہے، ہم تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں اور دین کو بھی تھامے ہوئے ہیں۔

ماسکو کی جامع مسجد کے خطیب سے ملاقات:

ماسکو میں دو مسجدیں ہیں، ایک تو ابھی واگزار ہوئی ہے، یہ پرانی اور تاریخی مسجد ہے جبکہ مرکزی مسجد جو کہ ماسکو میں منعقد ہونے والی اولمپک گیمز کی بلڈنگ کے ساتھ واقع ہے، یہ کبھی بند نہیں ہوئی۔ دس اگست کو ہم اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے گئے تو اس کے دفتر

میں حسن حضرت سے ملاقات ہوگئی۔ یہ مسجد کے امام اور نائب خطیب ہیں۔ کوٹ کے ساتھ انہوں نے ٹائی لگا رکھی تھی، کلین شیو تھے اور سر پر سفید پگڑی تھی، اپنے خوبصورت اور ماڈرن سوٹ سے مزین دفتر میں براجمان تھے۔ ان کا سیکرٹری بھی کلین شیو نوجوان لڑکا تھا۔ مغربی لباس زیب تن کیے دو نوجوان لڑکیاں بھی موجود تھیں، لڑکے بھی تھے، ہمارے آنے پر وہ چلے گئے۔ امام صاحب سے تعارف ہوا اور پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ امام صاحب عربی نہیں جانتے تھے۔ میں نے سوچا چلو بول نہیں سکتے تو سمجھتے تو ہوں گے مگر وہ اس سے بھی قاصر تھے..... تھوڑی دیر بعد ہی میں نے حضرت صاحب سے داڑھی کا سوال کر دیا، اب انہوں نے کافی دیر جواب دینے میں لگا دی۔ حاصل کلام یہ تھا کہ داڑھی تو عیسائی رکھتے ہیں، یہ تو ان کی نقل ہے حالانکہ حضرت صاحب کو ٹائی میں ان کی نقل نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے کہا عیسائیوں کی مخالفت صرف ان کاموں میں ہے جن میں اللہ کے رسول ﷺ نے مخالفت کی ہے اور یہ کہ عیسائیوں کی مخالفت ان کے غلط کاموں میں ہے۔ اب اگر عیسائی رفاہ عامہ کا کام کریں تو ہم اس سے رک جائیں گے؟ اس کے بعد حضرت صاحب کہنے لگے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی داڑھی زندگی کے اوائل میں تھی اور آخر میں نہیں تھی، اس لیے میری بھی نہیں ہے۔ اس پر میں نے ”نعوذ باللہ“ کہہ کر اللہ کی پناہ مانگی اور امام صاحب سے کہا کہ آپ مجھے اس کی دلیل دیں۔ وہ الٹا مجھے کہنے لگے آپ دلیل دیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی داڑھی تھی۔ اس پر میں نے انہیں داڑھی کی حدیثیں پڑھ کر سنا دیں اور کہا کہ امام بخاری، ترمذی اور نسائی جو ترکستان میں پیدا ہونے والے عظیم محدثین ہیں، ان کی کتابیں مجھے دیجیے میں دلائل آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ اس پر امام صاحب خاموش ہو گئے اور پھر اس کے بعد ہم نے اس جاہل انسان سے گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور دفتر سے نکل کر مسجد میں آ گئے۔

سنا تھا کہ مسجد میں ظہر اور عصر کی دو نمازیں باجماعت ہوتی ہیں مگر آج تو وہ بھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔ البتہ نوجوان جوڑے ضرور مسجد میں آتے، امام صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے اور پھر چلے جاتے۔ یہ عقده ہم پر اس وقت کھلا جب اس دفتر کے دروازے پر ہماری

نظر پڑی، وہاں لکھا ہوا تھا اسلامی مسائل معلوم کرنے کا دفتر اور یہ کہ نکاح کی فیس کم از کم ۳۰۰ روپل ہے۔ اب پتا چلا کہ یہ جو عریاں لباس میں جوڑے یہاں آئے ہیں یہ نکاح کے لیے آئے ہیں اور پھر حضرت صاحب بھی واپس جانے لگے تو اب ان کی پگڑی بھی غائب تھی اور ایک سوئڈ بوئڈ نوجوان ہاتھ میں بریف کیس تھامے واپس گھر جا رہا تھا، بالکل اسی طرح جس طرح دفتر میں کوئی بابو ڈیوٹی دے کر واپس جاتا ہے۔

اب سمجھ میں آیا کہ ماسکو چونکہ دارالحکومت ہے، مسلم ممالک کے سربراہ یہاں آتے تھے، اب وہ مسجد میں جانا چاہیں، جمعہ پڑھنا چاہیں تو ان کے لیے محض دکھاوے کے لیے روس نے یہ انتظام کر رکھا تھا۔ اس ضرورت کے علاوہ مجھے ایسے امام کی اور کوئی حاجت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

کریملن کی سیر اور ریڈسکوآر میں لینن کی لاش:

ماسکو میں کریملن وہ جگہ ہے جہاں روس کے بادشاہ رہا کرتے تھے۔ پھر زار ان روس کی بادشاہی ختم ہوئی اور یہاں کمیونسٹ حکمرانوں کا بسیرا ہوا۔ اب کریملن میں پلسن کا دور ہے۔ کریملن جو کہ کئی مربع اراضی پر پھیلا ہوا ہے، ہم اسے دیکھنے کے لیے گے تو ریڈسکوآر میں دس دس روپل کی ٹکٹیں فروخت ہو رہی تھیں، لوگ خرید رہے تھے، ہم نے بھی خریدیں اور پھر ۳۵-۴۰ مردوں اور عورتوں کے قافلے کو ایک معلم کی سربراہی میں دے دیا گیا اور وہ ہمیں لے کر کریملن کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ اسی طرح گروپ بنتے جا رہے تھے اور انہیں معلمین جو کہ مرد اور خواتین تھیں، ان کے حوالے کیا جا رہا تھا..... جس گروپ میں ہم تھے اس کے معلم نے کوئی پندرہ بیس جگہوں پر کھڑے ہو کر دس دس اور پندرہ پندرہ منٹ تقریر کی۔ ایک جگہ پر آگ جل رہی تھی، ارد گرد پھول پڑے تھے، یہاں زاروں نے کمیونسٹوں کو قتل کیا تھا۔ ایک جگہ بینا تھا یہاں کمیونسٹ مفکرین مارکس اینجلس وغیرہ کے نام لکھے ہوئے تھے۔ کریملن کے اندر گئے تو کہیں زاروں کی رہائش تھی اور کہیں ان کے آثار کا عجائب گھر..... ایک جگہ جہاں چار گرجا گھر تھے اور یہ کافی بڑے اور تاریخی تھے، ان میں سے ایک گرجا گھر کا تعارف کراتے

ہوئے روسی معلم نے کہا کہ اس کی تعمیر کے لیے ماسکو کے بادشاہ نے روم سے کاریگر منگوائے اور اسے بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا۔

روسی معلم کی اس بات کا ترجمہ جب میرے مترجم ساتھی نے روسی سے عربی میں کیا تو میری نگاہوں کے سامنے تاریخ کے وہ اوراق گھومنے لگے کہ جب ۸۵۷ھ میں عثمانی خلیفہ سلطان محمد فاتح نے عیسائیوں کے سیاسی اور مذہبی مرکز قسطنطنیہ شہر پر قبضہ کر لیا اور اس کا نام بدل کر استنبول رکھ دیا، جس کا معنی ترکی زبان میں ”دارالاسلام“ ہے، مسلمانوں کا اقتدار اور عظمت اس وقت عروج پر تھی کہ ایک طرف ترکوں نے آرتھوڈکس عیسائیوں کے مرکز پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر آگے بڑھ کر مشرقی یورپ کے ملکوں یوگوسلاویہ، بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری تک کو فتح کر لیا، دوسری جانب سارا ترکستان اور دریائے وولگا کے کنارے پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی اور ماسکو تو ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو کبھی مسلمانوں کی باجگزار ہو جایا کرتی تھی اور کبھی آزاد..... اب ۸۸۶ھ میں ماسکو کے بادشاہ نے روس کو مضبوط کرنا شروع کر دیا اور عزم کر لیا کہ وہ قسطنطنیہ کا بدلہ مسلمانوں سے لے کر رہے گا۔ یہاں کے امراء نے قسطنطنیہ میں عیسائیوں کے مرکز کو ماسکو میں منتقل کر لیا، کریملن میں گرجے بن گئے اور تیاریاں شروع ہو گئیں، تاریخی مسلمانوں اور روسی عیسائیوں کے درمیان لڑائیاں نئے سرے سے شروع ہو گئیں..... خیر یہ تو تاریخی باتیں ہیں مگر اس وقت جو قابل غور بات تھی وہ یہ کہ کمیونسٹ انقلاب تو مذہب کا دشمن تھا اور انہوں نے مسلمانوں کی کوئی مسجد باقی نہ چھوڑی مگر کریملن میں گرجے باقی ہیں ان گرجوں پر لوہے کی منوں وزنی گھنٹیاں باقی ہیں۔ ۶۲ ٹن کا ایک بڑا گھڑیال بھی یہاں پڑا تھا اور ان گرجوں کے بیناروں پر جو سونے کے پترے ہیں اور سونے کی صلیبیں ہیں، کمیونسٹوں نے انہیں بھی ہاتھ نہیں لگایا تو کمیونسٹ جو کہ مذہب دشمن تھے ان کا نشانہ بھی اس انقلاب کی زد میں اسلام ہی تھا اور یہ اسی دشمنی کا بدلہ تھا جسے زاروں نے شروع کیا اور کمیونسٹوں نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

کریملن دیکھنے کے بعد اب اس کے مرکزی دروازوں کے درمیان دیوار کے ساتھ بنی

عمارت کی طرف چل دیے، اس میں لینن کی حنوط شدہ لاش رکھی گئی ہے، سامنے کھلا میدان ہے جسے ریڈسکوائر کہا جاتا ہے، یہیں کمیونسٹ انقلاب کی سالانہ پریڈ ہو کرتی تھی جسے دیکھنے کے لیے دنیا بھر کے اکثر سربراہ آیا کرتے تھے۔

کارل مارکس یہودی کے فلسفے کو عملی جامہ پہنانے والے لینن کی لاش کو دیکھنے کے لیے ایک لمبی لائن لگ چکی تھی، تماشائی بڑی سخت تھی، پولیس والوں نے مجھ سے کیمرا بھی رکھوا لیا۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو پہرے داروں کی گارڈ تبدیل ہو رہی تھی، عیسائیوں کے مذہبی گھڑیال کی گھنٹیاں کریملن کے گرجا نما بیناروں سے بجیں اور پھر ساکت و جامد کھڑے دو پہرے داروں کی جگہ دوسرے پہرے دار آ کر کھڑے ہو گئے۔ ماسکو کے شور و مز میں مومی مجسمے رکھے ہوتے ہیں، یقین جانیے یہ پہرے دار بھی مومی مجسمے ہی لگتے تھے، یہ مین گیٹ کے دائیں بائیں آمنے سامنے کھڑے تھے جب ہم یہاں سے گزرنے لگے تو ان کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی، پہرے دار کہ جس کے لیے ہنسی ممنوع ہے، وہ بھی تھوڑا سا مسکرائے بغیر نہ رہ سکا..... اب ہم اندر چلے گئے، ہمارے ساتھی عبدالقدوس کے سر پر ٹوپی تھی، ایک پہرے دار آگے بڑھا اور اس نے ٹوپی سر سے اتار کر عبدالقدوس کے ہاتھ میں تھما دی یعنی ان کے ہاں سر پر ٹوپی رکھ کر لینن کی زیارت کرنا لینن کی توہین تھی۔ خیر اب ہم اندر چلے گئے، وہاں لینن جامد و ساکت پڑا تھا، ٹائی اور کوٹ پہنے ہوئے تھا، روشنیاں اس کے جسم پر پڑ رہی تھیں، باقی اندھیرا تھا۔

اب ہم لینن کے مقبرے سے باہر آچکے تھے اور مقبرے کے پیچھے باقی روسی سربراہوں کی قبریں تھیں اور ہر قبر پر صاحب قبر کا مجسمہ تھا..... یہ برزنیف ہے جس نے روسی فوج کو افغانستان میں داخل کیا، وہ مر گیا تو اس کے بعد آندرو پوف تھا، اس کی قبر بھی یہاں تھی..... چرلکو بھی یہیں دفن تھا۔ اس کے بعد کورباچوف آیا اور پورا کمیوزم نظام ہی دفن ہو گیا..... کورباچوف اب یہاں دفن نہیں ہو سکے گا، اس لیے کہ اس کے دور میں کمیوزم جو دفن ہو گیا ہے۔

غرض یہ بیسویں صدی کے فرعونوں کا دور تھا جس کا کچومر جہاد کی ضربات حق نے نکالا۔ مصر کے فرعونوں کی لاشوں کو بھی حنوط کر کے مقبرے بنائے جاتے تھے اور جو سب سے بڑا فرعون موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوا اس کی لاش آج بھی سامان عبرت ہے، جو اللہ کی قدرت سے سمندر میں غرق ہونے کے بعد محفوظ ہے۔ اس فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو کہا تھا کہ ایک بلند و بالا محل تیار کرو تا کہ میں اس پر چڑھ کر دیکھوں کہ موسیٰ کا رب کہاں ہے اور پھر وہ پاگل اس محل پر چڑھ کر آسمان کی طرف تیر چلا تا رہا اور پھر کہتا رہا کہ موسیٰ کا رب مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا..... سٹالن کے بعد روسی سربراہ ٹروشیف بھی ایسا ہی جدید روسی فرعون تھا کہ اس کا سائنسدان جب پہلا خلائی سیارہ اسپوٹنگ خلاؤں میں اڑا کر واپس آیا تو ٹروشیف نے کہا ہم نے زمین کے گرد چکر لگا لیے، خلاؤں میں گھوم لیا، ہمیں مذہبی جنونیوں کا رب کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

غور کیجیے! ان دونوں پاگل فرعونوں کی ذہنیت ایک ہے، اس نے اپنے زمانے کے مطابق کچی اینٹوں کے محل پر چڑھ کر ایک بات کہی اور آج کے اس فرعون نے آگ میں ڈھالے ہوئے لوہے کی مشین یعنی جہاز پر چڑھ کر وہی بات دہرائی..... دونوں کا دور گزر چکا، مجسمے باقی رہ گئے، لاشیں سامان عبرت ہیں۔

جہاد و قتال..... زندہ باد

ہر باطل نظام..... مردہ باد

اللہ تعالیٰ نے اپنے ماننے والوں کو ایک بار پھر آگاہ کر دیا ہے کہ مجھ پر مضبوط ایمان رکھ کر جہاد و قتال کے راستے پر چلتے رہو گے تو پھر سنت یہی ہے کہ باطل مٹا رہے گا، حق ابھرتا رہے گا۔

شیطانی مذہب اور سٹالن کا انجام:

کریملین اور لینن کو دیکھنے کے بعد پہلا تصور جو صاحب فکر و عقل کے ذہن میں پیدا ہوتا

ہے وہ یہ ہے کہ کمیونزم کے اٹاوی نظریے کو جس نے پھانسی دی وہ تو بلاشبہ اسلام کا نظر یہ جہاد و قتال ہے، جس کا عملی مظاہرہ افغانستان میں ہوا، جب کہ فکری طور پر کمیونزم اپنی حرکتوں سے ہی اعلان کر رہا تھا کہ وہ ناکام ہے..... اب ایک طرف تو وہ مذہب کو ایفون کہتا تھا، عبادت کو فضول رسومات کے نام سے تعبیر کرتا تھا، اس مقصد کے لیے اس نے مساجد ڈھا دیں، کلیسے بند کر دیے، کہیں کوئی ایک آدھ کلیسا بھی نقصان سے دوچار کر دیا..... مگر اس نظام کے حاملین نے اپنے لیے ایک نیا معبود گھڑ لیا اور اس کے ساتھ دوسرے کئی معبود..... کیا لینن کا مقبرہ عبادت گاہ نہیں؟ اس کے احسانات تلے دب کر اس کی لاش کو حنوط کر کے اس کا احترام نہیں کیا جاتا؟ جُسموں کی طرح وہاں جو پہرے دار کھڑے کیے ہیں ان کا کیا مقصد ہے؟ اس کے احترام کے لیے سر پر ٹوپی نہ رکھنے دینا آخر یہ عبادت کی رسم نہیں تو اور کیا ہے؟ بیرونی سربراہ یہاں آئیں اور ہاتھ باندھے ایک منٹ کے لیے ساکت و جامد اس کی لاش پر کھڑے رہیں، یہ عبادت نہیں تو اور کیا ہے.....؟ پھر کمیونسٹوں کے اس معبود کے جو حواری ہیں وہ کویا کہ ولی ٹھہرے۔ ان کے جُسموں، ان کی یادگاروں پر پھول چڑھانا اور آگ کا جلایا جانا یہ مراسم عبادت نہیں تو اور کیا ہیں.....؟ غرض کمیونسٹوں نے لاکھوں انسانوں کا قتل عام کیا، عبادت گاہیں مسمار کر دیں، کتب خانے جلا دیے ماں، بہن اور بیٹی کے احترام تک کو ختم کر دیا اور کہا کہ یہ بھی مذہب ہے اور اشتراکیت یہ ہے کہ یہ محض عورتیں ہیں، عورت ہونے کے ماتے بلا امتیاز ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یہ احترام وغیرہ سب مذہبی ایفون ہے..... کمیونسٹوں نے عملی طور پر یہ سب کچھ روس میں کر دکھایا اور سب مذہبوں کو ختم کر کے انھوں نے کمیونزم کا ایک مذہب بنا لیا۔ لینن اور اس کے حواریوں کی پوجا شروع کر دی..... حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا تصور انسان کی فطرت میں ہے اور وہ اپنی فطرت سے جدا نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے حقیقی معبود کی عبادت نہیں کرے گا تو شیطان کی عبادت کرے گا اور غیر اللہ کی عبادت شیطان ہی کی عبادت ہے، وہ غیر اللہ کمیونسٹوں کا لینن ہو، ہندوؤں کا رام ہو، عیسائیوں کا سینٹ پال ہو یا مسلمان کہلانے والوں کا قبر میں مدفون کوئی ولی ہو..... اس کی عبادت دراصل

شیطان کے راستے کی پیروی ہے اور شیطان کے راستے کی پیروی ابلیس ہی کی عبادت ہے۔
 لینن کے بعد سٹالن کہ جس کا ظلم و ہر بریت تاریخ کا ایک حصہ ہے، اس کی قبر پر پہنچا تو
 مجھے اس کی بیٹی ”سویلا نہ“ یاد آگئی کہ جس نے اپنے باپ کی موت کو دیکھ کر روس چھوڑ دیا تھا
 اور امریکہ جا پہنچی، اس نے عیسائیت اختیار کر لی، اس نے دنیا والوں کو بتایا کہ جب میرا باپ
 مرنے لگا، وہ کہ جو رب کو گالیاں نکالا کرتا تھا اور اسے ماننے والوں کو سائبریا کے ٹھہرتے اور
 جامد برفانی علاقوں میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا کرتا تھا..... اس ظالم پر جب نزع کا وقت آیا،
 آنکھیں پتھرا کر آسمان کی طرف جا لگیں تو اس کی بیٹی ”سویلا نہ“ کہتی ہے کہ میرا باپ ہاتھ
 اٹھاتا، انگشت شہادت آسمان کی طرف کرتا اور پھر ہاتھ نیچے گر جاتا، وہ زبردست کرب میں
 مبتلا تھا مگر بول نہ سکتا تھا، وہ اپنے عمل سے بتلا رہا تھا کہ میں جسے نہ مانتا تھا اب اس کی گرفت
 میں ہوں، کاش! بولنے کو ایک آدھ منٹ مل جائے، تو بہ کر لوں، لوگوں کو اپنے اور ان کے
 خالق و مالک سے باخبر کر دوں مگر اس نے اپنے پیشرو فرعون موسیٰ کی طرح وقت ضائع کر دیا
 تھا، وہ فرعون کہ جو اپنے آپ کو رب کہلاتا تھا، جب ڈوبنے لگا تو کہنے لگا میں اب موسیٰ اور
 اس کے رب پر ایمان لایا..... اللہ کا فرشتہ آگے بڑھا، منہ میں مٹی ڈال دی کہ اب ایمان کا کیا
 فائدہ؟ یہ تو نزع کا وقت ہے، تو بہ کے دروازے بند ہونے کا وقت ہے، دنیا امتحان گاہ تھی،
 وہاں امتحان ہو چکا، اب تو نتیجہ سننے کا وقت ہے۔ چنانچہ اب اسے سننے اور دیکھے بغیر چارہ
 نہیں..... دیکھ کہ اب تیرا بنتا کیا ہے؟

اللہ کے طرف سے ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن میں اعلان موجود ہے:

ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۵۹﴾ (اندھخانہ: ۵۹)

”عذاب کا مزہ (چکھ تو) دنیا میں (بڑا جاہل اور معزز بنا پھرتا تھا۔“

اور یہ سزا اس لیے ہوگی کہ:

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿۲۳﴾ (انفالہ: ۲۳)

”وہ عظمتوں والے اللہ تعالیٰ کو مانتا ہی نہ تھا۔“

مجھے ایک تازق مسلمان نے بتایا کہ اسی کے دور میں ہمارے گاؤں کے پانچ آدمیوں نے اپنے گھر کے ایک کمرے میں نماز پڑھی، انہوں نے سٹائن کی تصویر پر کپڑا ڈال دیا کہ اس کے دور میں ہر گھر کے اندر اس کی تصویر لٹکانا ضروری قرار دے دیا گیا تھا..... ان مسلمانوں نے نماز تو پڑھ لی مگر رب کے حضور سر جھکانے کی خبر حکومت کو مل گئی۔ چنانچہ نماز کی ادائیگی اور سٹائن کی تصویر پر پردہ ڈالنے کے جرم میں ان پانچ آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا، اس کے بعد آج تک کسی کو خبر نہیں کہ ان پانچ نمازیوں کے ساتھ کیا ہوتی.....؟

ڈالر پر پی کو پکڑنے کی دوڑ:

کیونز م کی ناکامی کے بعد روس میں سرمایہ داری کی جانب دوڑ تیز ہو گئی ہے مگر یہ دوڑ صنعت لگانے یا محنت کرنے کی صورت میں نہیں بلکہ ڈالر کے حصول کے صورت میں ہے۔ ہم جب یہاں آئے تو ایئر پورٹ پر ۱۳۵ روپل کا ایک ڈالر ملا، اس کے بعد ۱۵۰ کا اور یہ بڑھتے بڑھتے اب دو سو چالیس تک پہنچ گیا ہے۔ لہذا ہر شخص زیادہ سے زیادہ ڈالر جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ خود بخود ہی بڑھ جاتا ہے، محنت کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس صورتحال سے روپل گرنا جا رہا ہے اور مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے، ہر شخص ڈالر ہی کے ذریعے راتوں رات امیر بننا چاہتا ہے۔ ان لوگوں کی غیر ملکیتوں پر خاص طور پر نظر ہوتی ہے کہ اس کے پاس ڈالر ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن میٹرو اسٹیشن اور شہر کی اکثر بارونق جگہوں پر اوباش نوجوانوں کے غول دکھائی دیں گے، موقع ملے تو یہ لوٹنے اور قتل تک کرنے سے گریز نہ کریں گے۔ ہم سے نہ جانے کتنے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کے پاس ڈالر ہیں؟ ہم چار ساتھی تھے، یقین جانیے اکیلے کا تو کوئی حال نہیں۔ مجھے پاکستانی نوجوانوں نے بتلایا کہ ابھی اسی چکر میں ایک پاکستانی نوجوان کو چند دن پہلے روسی اوباشوں نے قتل کر دیا..... ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ نوجوان غیر ملکی سے ڈالر پوچھتے ہیں کہ ہم تبدیل کر دیتے ہیں، وہ تبدیل کرنے کے لیے جونہی ڈالر نکالے گا یہ جھپٹ کر بھاگتے بنیں گے اور کہیں شنوائی نہ ہوگی۔ ریلوے اسٹیشن پر دیکھا کہ ٹکٹیں بلیک میں فروخت ہو رہی ہیں، پولیس گھوم رہی ہے، لوگوں کو ٹکٹ نہیں مل رہا،

لڑکیاں اور لڑکے ہاتھوں میں نکتہ تھامے بلیک میں فروخت کر رہے ہیں۔ غرض پوری قوم پیسے کے پیچھے بھاگ رہی ہے اور پیسے سے روں میں جو شخص جو کام بھی چاہے وہ کروا سکتا ہے۔ عام لوگ تو رہے درکنار خود حکومت کا یہ حال ہے کہ غیر ملکوں سے ریلوے نکتہ کی قیمت تین گنا زیادہ۔ ہوائی جہاز سے سفر کیا جائے تو ڈالروں میں۔ اچھے ہوٹلوں میں رہا جائے تو وہ بھی ڈالروں میں گے..... اور تو اور تاشقند میں ایئر پورٹ کا قلی جو ہمارا سامان ٹرائی پر رکھ کر باہر لایا وہ بھی ڈالروں میں تھا۔ بہر حال ان ڈالروں سے بچا جائے تو پھر روں مہنگا نہیں بلکہ روہل کے حساب سے غیر ملکوں کے لیے بہت سستا ہے۔

سرمایہ داری کی یہی وہ دوڑ ہے کہ جس کا حل لینن نے اشتراکیت میں ڈھونڈا اور ستر سال تک وہ اور اس کے جانشین اسی کوشش میں لگے رہے مگر ستر سال بعد وہ جہاں سے شروع ہوئے تھے وہاں سے بھی بدتر حالت میں جا گئے اور اب پھر یہ قوم برطانیہ اور امریکہ کے پیچھے دوڑ رہی ہے، جمہوریت کو اپنا رہی ہے، ڈالر کو پوج رہی ہے اور عیسائیت کے ساتھ اسی طرح کی برائے نام وابستگی اختیار کر رہی ہے جیسی وابستگی امریکہ اور برطانیہ میں ہے۔ اور جو لوگ عیسائیت کے ساتھ مذہبی وابستگی کا عملی اظہار کرتے ہیں تو وہ اظہار وہی ہے جو فرسودہ، دقیانوسی، غیر عقلی اور مشرکانہ ہے۔ کریملن کے سامنے ایک کونے میں ولیوں کے دو جُسمے تھے، ایک روسی لڑکی یہاں کھڑی تھی، دیا جائے ہوئی تھی اور نذرانے وصول کرتی تھی۔ اسی طرح اتوار کے روز کئی چوکوں پر میں نے دیکھا کہ مذہبی لوگ ایک میز پر دیے جائے، ولیوں کی تصویریں لٹکائے، صلیب رکھے ہوئے نذرانے وصول کر رہے ہیں اور یہ عقیدہ رکھے ہوئے ہیں کہ اتوار کو ولیوں کی روئیں آتی ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کے ہاں اتوار کو آتی ہیں ہمارے ہاں جمعرات کو آتی ہیں۔ (اللہ کی پناہ ان خرافات سے)

لینن کی لاش دیکھ کر سامنے بڑے بازار میں آیا تو اعلان ہو رہا تھا کہ ماسکو کی سیر کے لیے بسیں تیار ہیں، جو جانا چاہیں نکتہ حاصل کر کے بسوں میں بیٹھ جائیں۔ ہم بھی نکتہ لے کر بس میں جا بیٹھے، بس چل پڑی، ایک شخص ماسکو کی تاریخ بتلاتا رہا اور پھر ایک بڑے قبرستان

میں داخل ہوا۔ یہاں ولیوں کے مزار تھے، ان کی قبروں پر پھول تھے اور چراغ جل رہے تھے اور یہ شخص زائرین کو ان کے قصے، کرامات اور دیگر خرافات سے آگاہ کر رہا تھا..... تو اب یہ ہے روسی قوم کا حال کہ جن خرافات سے بھاگ کر اس نے کمیونزم کو اپنایا تھا، ستر سال کی ٹھوکروں کے بعد مذہبی، معاشی اور سیاسی طور پر پھر ستر سال پیچھے جا پہنچی ہے..... کاش! جس نظریے نے اسے ستر سال پیچھے دکھایا ہے اس کے حاملین اور آگے بڑھیں اور اسے اس حق سے آشنا کریں جو اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ لے کر آئے ہیں۔

ماسکو میں میٹرو:

ماسکو کراچی کی طرح بہت بڑا شہر ہے مگر سڑکیں صاف ستھری، بڑی بڑی اور رش سے پاک۔ رش نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب میٹرو یعنی زیر زمین ٹرین ہے۔ یہ زمین کے نیچے پورے ماسکو میں پھیلی ہوئی ہے، ہر سٹیشن پر خود کار سیڑھیاں ہیں جن سے لوگ ایک جانب نیچے اتر رہے ہوتے ہیں اور دوسری جانب اوپر چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ آٹھ دس بوگیوں کی گاڑی ہوتی ہے، ہر سٹیشن پر دو پلیٹ فارم ہوتے ہیں، ایک گاڑی کی آمد کے لیے اور دوسرا روانگی کے لیے۔ دونوں گاڑیاں بیک وقت اور ہمہ وقت آ جا رہی ہوتی ہیں، انتظار کا سول ہی پیدا نہیں ہوتا، ان کی رفتار بھی تیز ہے۔ ایک روبل میں بے شک سارا ماسکو زیر زمین کھومتے رہیں۔ ہر اہم جگہ یہ میٹرو ٹرین جاتی ہے البتہ اسے سمجھنا خاصا مشکل کام ہے۔ ایک سٹیشن پر لکھا تھا ۱۹۰۵ء یعنی یہ کام ان لوگوں نے بیسویں صدی کے اوائل سے شروع کر رکھا ہے اور جوں جوں شہر پھیلتا گیا توں توں یہ میٹرو بھی پھیلتی چلی گئی۔

دوسرا یہ کہ تمام روسی شہروں میں زمین کے اوپر سڑک کے درمیان بھی ڈبل ریلوے لائن موجود ہے، دو دو بوگیوں کی ٹرین آ جا رہی ہے اور ان کے دونوں جانب کاریں اور بسیں چل رہی ہیں۔ ان بسوں میں بجلی والی بسیں بھی ہیں ان سڑکوں پر ریلوے لائنیں اس انداز سے بچھائی گئی ہیں کہ بجلی پر چلنے والی ان ٹرینوں کی لائنوں کو کاریں اور بسیں بھی کراس کر لیتی

ہیں۔

یہاں اختلاط مرد و زن کے نہایت شرمناک مناظر تھے۔ نیز اتزیوں میں ڈل کر سور کا گوشت جگہ جگہ لکڑیوں کی طرح لمبی قطار کی شکل میں بکتا ہوا دیکھا۔ شراب اس طرح نوش کی جاتی ہے جس طرح پیپسی اور فائٹا۔ سچی بات ہے یہ سب کچھ دیکھ کر دل گھبرا اٹھتا ہے کہ کب اس گندے اور غلیظ ماحول سے جان چھوٹے گی، ماسکو سے تو بہر حال نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ حافظ عبدالعزیز تو عبدالقیوم کے ہمراہ ماسکو میں ٹھہر گئے جبکہ میں نے اپنے ساتھی ابو الرشید کو لیا، تازان کا ٹکٹ خریدا اور ریل کے ذریعے ۱۱ اگست کو رات پونے گیارہ بجے ماسکو سے نکل کھڑے ہوئے، اللہ نے چاہا تو دوبارہ ماسکو میں آئیں گے جس طرح کہ ہمارے آباء آیا کرتے تھے، تب ماسکو میں سور اور شراب نہیں ہوگی بلکہ یہ شہر انگریزی کے لفظ "Mosque" کا عملی منظر پیش کر رہا ہوگا۔ ہمارے اس فقرے کو لوگ پاگل پن کہیں گے مگر یہ تو اس وقت بھی کہتے تھے جب افغان مجاہدین نے روس سے لکڑی تھی، اللہ کے رسول ﷺ پیٹ پر پتھر باندھے جب غزوہ خندق میں قیصر و کسریٰ کی فتح کی نوید سنا رہے تھے تو آج کے دانشوروں کی طرح اس وقت کے دانشور روسائے عرب بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے کہ کھانے کو ملتا نہیں اور قیصر و کسریٰ کو زیر کرنے کی باتیں ہیں۔ مگر اللہ نے بتلا دیا ہے کہ میں اسی راستے یعنی جہاد و قتال سے ہی مجاہدوں کے ہاتھوں سپر پاروں کو زیر و زیر کیا کرتا ہوں۔



گم کردہ عظمتوں کی تلاش میں قازان سے آسٹراخان تک

دریائے وولگا کے کنارے کنارے:

ہم دونوں ساتھی ماسکو سے قازان جانے والی گاڑی کے کیبن میں جا کر بیٹھ گئے، میں قازان کے تصور میں گم تھا کہ روسی عورت ہمارے کیبن میں داخل ہوئی اور بیٹھ گئی، پھر ایک اور نوجوان عورت عریاں لباس میں سامنے آ کر براجمان ہو گئی۔ یہ چار آدمیوں کے لیے کیبن تھا، رات یہیں گزارنا تھی۔ اب گاڑی چل چکی تھی اور ہم دونوں سوچ میں پڑ گئے کہ اب ہم کیا کریں اور کہاں جائیں..... یا اللہ! تو ہی مدد کر اور پھر دو تین منٹ نہ گزرے ہوں گے کہ دو تاتاری نوجوان ہمارے کمرے میں داخل ہوئے، السلام علیکم کہا اور کہنے لگے ہم نے آپ کو دیکھا، ہمارا کیبن ساتھ والا ہے، وہاں ہمارے ساتھ بھی دو عورتیں ہیں، ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاس رہیں۔ ہم نے کہا ہم تو پہلے ہی پریشان تھے، اس پریشانی سے نجات مل جائے تو اور کیا چاہیں گے، ان عورتوں کی منت کریں یہ اکٹھی ہو جائیں اور ہم مسلمان بھائی یہاں اکٹھے ہو جائیں۔ اللہ نے ہماری سن لی، یہ لڑکیاں مان گئیں اور ہم چاروں بھائی اکٹھے ہو گئے۔ (الحمد للہ)

ہمارے یہ دونوں ہم سفر نوجوان ساتھی آزاد اور مالدار تاتاری تھے، ماسکو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب کاروبار کرتے تھے، ہم نے اکٹھے کھانا کھایا، تعارف ہوا، بلکی پھلکی

گفتگو ہوئی، نماز پڑھی اور پھر سو گئے..... صبح بیدار ہوئے، نماز اور ناشتے کے بعد گفتگو شروع ہوئی، روس کے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے احوال سے انھوں نے مجھے آگاہ کیا اور مجھ سے انھوں نے پاکستان کے احوال، جہاد افغانستان کی یادیں، ایران و عراق اور پھر عراق اور کویت کی جنگ پر، پھر دینی مسائل پر انھوں نے مجھ سے سوالات کیے، اللہ کی توفیق سے میں انھیں جوابات دیتا رہا اور وہ بغور سنتے رہے۔

آخر میں ان صالح طبیعت نوجوانوں سے دو باتیں عرض کیں، ایک یہ کہ آپ تاناریوں کو روسی گھٹن کے بعد اتنی سی آزادی ملی ہے کہ جس قدر چاولوں کی ایک دیگ سے ایک چاول اٹھا کر اس کا ذائقہ زبان کی نوک پر چکھا جائے اور یہ انتہائی قلیل سی آزادی آپ کو افغان جہاد کی برکت سے ملی ہے..... اب آپ کا فرض یہ ہے کہ آپ اسلام کو سمجھیں اور اسلام کو سمجھنے کے لیے کتاب و سنت کی طرف رجوع کریں، قرآن کا مطالعہ کریں، بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی جیسی احادیث کی کتب پڑھیں اور پھر مسلمانوں کو اس طرف دعوت دیں۔ فی الحال یہ دعوت کا کام کریں، مذہبی تعصبات کی دعوت سے بچیں اور یہ سیدھی سادی اسلام کی دعوت لوگوں کو دیں، آپ نے اس قوم کو دوبارہ نئے سرے سے مسلمان بنانا ہے۔ عظمتوں کی طرف دوبارہ سفر شروع کرنے کی یہ پہلی سیڑھی ہے، اگلی منزلیں بعد میں آئیں گی۔

یہ گفتگو جاری تھی، راستے میں آنے والے دیہات اور قصبہات کا تعارف بھی جاری تھا، سارا علاقہ بڑا ہی خوبصورت اور شاداب تھا، ریلوے لائن کے دونوں جانب درختوں کی ایک قطار تھی جو ماسکو سے لے کر تازان تک ہمراہ رہی..... ہم ساڑھے بارہ بجے تازان میں پہنچ چکے تھے۔

تاتارستان کی تاریخی سیر:

تاتارستان میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا شرف عرب تاجروں کو حاصل ہے..... یہ عرب تاجر کہ جن میں نذیر حزمی ایک ممتاز داعی کی حیثیت رکھتے تھے، ان سے متاثر ہو کر تاتارستان

کے بادشاہ بلطوار نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد نذیر حزمی کو عی بادشاہ نے تاتاری وفد کا قائد بنا کر عباسی خلیفہ المتقدر باللہ (۲۹۵ھ تا ۳۲۰ھ) کی خدمت میں وفد بھیجا اور درخواست کی کہ وہ ایسے داعیوں کو ہمارے پاس بھیجیں جو ہمیں دین اسلام سمجھائیں اور پھر یہاں مسجدیں بنائی جائیں خلیفہ نے اس وفد کا بڑا احترام کیا اور پھر جوابی طور پر بادشاہ بلطوار کے پاس وفد بھیجا۔ جس میں ابن فضلان بھی شامل تھے، انھوں نے اس سارے سفر کی روداد لکھی جو کہ رسالہ ابن فضلان کے نام سے معروف ہے۔

شاہ بلطوار کا ایمان افروز واقعہ:

خلیفہ کا وفد جب بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے شاندار ضیافت کی، ضیافت سے فارغ ہوئے تو حسب رواج ایک شخص نے بادشاہ کے لیے منبر پر چڑھ کر دعا کی:

”اے اللہ! بلغار (تاتارستان) کے بادشاہ شاہ بلطوار کو سلامت رکھ۔“

اس پر ایک عرب نے کہا بادشاہ اللہ ہے اور ممبروں پر چڑھ کر کسی دوسرے کو بادشاہ کہنا مناسب نہیں اور پھر بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ امیر المؤمنین یعنی عباسی خلیفہ جو آپ کے امیر ہیں، انھوں نے بھی وصیت کر رکھی ہے کہ میرے لیے دعا کی جائے تو اللہ کا بندہ اور خلیفہ کہہ کر دعا مانگی جائے۔ اس پر بادشاہ نے پوچھا پھر میرے لیے کون سے الفاظ کہے جائیں جو جائز ہیں اس پر ابن فضلان کہتے ہیں میں نے کہا آپ کا اور آپ کے باپ کا نام لیا جائے۔ تب بلطوار نے کہا میرا باپ تو کافر تھا، میں نہیں چاہتا کہ میرے نام کے ساتھ میرے باپ کا نام آئے جو کہ کافر تھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے خود ہی کہا میرے امیر کا نام کیا ہے۔ ابن فضلان نے کہا ”امیر المؤمنین جعفر۔“ اس پر بادشاہ نے کہا تو کیا یہ نام میرے لیے جائز ہوگا؟ ابن فضلان نے ”نعم“ کہا تو بادشاہ نے فوراً کہا کہ آج کے بعد میرا نام جعفر ہے اور میرے باپ کا نام عبد اللہ ہے۔ لہذا اب دعا مانگنے والے نے یوں دعا مانگی:

”اے اللہ! اپنے بندے جعفر بن عبد اللہ کو سلامت رکھ جو کہ بلغار کا امیر اور امیر المؤمنین کا تعلق دار ہے۔“

تاریخوں پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ ایک طرف ترکستان کے حکمران تھے، دوسری جانب قازان سے اوپر اوف اور سائبیریا پر حکمرانی کرتے تھے، ماسکو کو انھوں نے تاراج کیا اور قازان سے لے کر آسٹراخان تک وہ حکمران تھے مگر ان ساری فتوحات کے باوجود دین اسلام ان میں اچھی طرح مستحکم نہ ہو سکا..... اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ کسی قوم کو ایسے ہی برباد نہیں کرتا بلکہ اس کے دیے ہوئے مواقع سے جب قوم فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیتی ہے تو پھر اللہ کے غضب کا کوڑا حرکت میں آتا ہے۔ لہذا اس قوم کے قریب اسی دور میں اللہ نے امام محمد بن اسماعیل، ابوعلیٰ ترمذی اور نسائی جیسے محدثین کو پیدا کیا کہ جن کی لکھی ہوئی کتابوں کا سارا عالم اسلام رہتی دنیا تک محتاج ہے۔ مگر یہ لوگ جغرافیائی اور قومی اعتبار سے قریب ہونے کے باوجود ان محسنوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے، کتاب و سنت کو مضبوطی سے نہ تھام سکے اور پھر مزید یہ کہ آپس میں انتشار کا شکار ہو گئے صرف دو لگا کا کنارہ ہی تین ریاستوں قازان، سرائے اور آسٹراخان میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔ پھر آپس میں لڑنے لگے اور اس لڑائی میں پھر وہ وقت بھی آیا کہ اپنے محکوم روسیوں سے ایک دوسرے کے خلاف مدد کے طالب ہونے لگے..... نتیجہ وہی نکلا جو نکلتا تھا کہ یہ آہستہ آہستہ روسی قیصروں اور زاروں کے پنجوں میں جکڑتے چلے گئے..... حتیٰ کہ کمیونسٹ انقلاب آیا تو ان میں سے کئی وہ لوگ بھی تھے جو اپنی اور اپنے مذہب کی عافیت اس انقلاب میں سمجھنے لگے، کچھ مخالفت کرنے لگے کچھ ساتھ دینے لگے مگر پانی سر سے گزر چکا تھا، کمیونسٹوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا جسے تاتارستان کہا جاتا ہے۔ اب میں اسی تاتارستان کے اہم شہر قازان میں تھا۔

قازان میں:

سب سے پہلے ہم قازان کی مرکزی اور بڑی مسجد مرجانی میں گئے۔ بڑی خوبصورت مسجد ہے، جب ہم اس میں پہنچے تو نماز ظہر ہو رہی تھی، نماز کے بعد مصر سے آئے ہوئے ایک عرب نے عربی زبان میں مختصر تقریر کی۔ امام مسجد نے اس کا تاتاری زبان میں ترجمہ کیا۔ نماز کے بعد امام صاحب سے ملاقات ہوئی اور پھر ریاض سعودی عرب کے سلفی نوجوان صالح بن

ریاض سے ملاقات ہوئی جو کافی دنوں سے اس سارے علاقے میں گھوم پھر رہے تھے۔ وہ کہنے لگے سب لوگوں کی توجہ کا مرکز ازبکستان ہے جبکہ اس دور دراز علاقے میں داعی حضرات کو زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا میں دیہات میں بھی گیا ہوں، لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں مگر کلمہ تک نہیں آتا۔ یہاں دعوتی کام کے سلسلے میں ہم دونوں کے درمیان کافی دیر تبادلہ خیال ہوتا رہا، میں نے بعض تجاویز پیش کیں جنھیں شیخ نے پسند کیا۔

مرجانی مسجد کے بعد ہم تازان شہر میں کریملن یعنی ایوان صدر گئے، دریائے وولگا کے کنارے پندرہ بیس ایکڑ میں انتہائی خوبصورت مقام ہے اور یہ وہی مقام ہے جہاں بلطوار بادشاہ نے اسلام قبول کیا تھا، پھر زاروں نے اس پر قبضہ کیا تو انھوں نے یہاں مسجد کو ڈھا کر گرجا بنا دیا۔ میں جب اس گرجے کے قریب گیا تو دیکھ کر جگر پھٹنے لگا کہ جہاں اللہ واحد کی عبادت ہوتی تھی اب وہاں تثلیث کے پجاریوں کا قبضہ ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ اس سابق مسجد اور حالیہ گرجے کے اوپر صلیب بنائی گئی ہے اور صلیب کے نیچے بلال بنایا گیا ہے۔ بلال مسلمانوں کا نشان ہے اور صلیب عیسائیوں کا۔ یعنی صلیبوں نے یہ کام کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ صلیب بلال پر غالب آگئی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بلال مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو کہ بس تمھاری ووٹ افغانستان تک ہی تھی جبکہ میں تو ابھی تازان میں مغلوب ہوں..... صلاح الدین ایوبی کے بیٹو! مجھے کب غلبہ نصیب ہوگا، توحید کے داعیو! توحید کا نشان تثلیث سے کب اونچا ہوگا؟ میرے نیچے مسجد عرصہ دراز سے رکوع و سجود کو ترس گئی ہے، اس میں کب اذان بلائی کوئے گی؟ کب اللہ اکبر کا آواز بلند ہوگا کہ جس کی گرج سے صلیب اور اس کے پجاری ٹوٹ کر رہ جائیں گے۔

ہاں..... تو یہی وہ مقام ہے جہاں عیسائیوں نے اور پھر کمیونسٹوں نے ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا، امیر تازان کو قتل کیا تھا، ملکہ تازان کو عیسائی بننے پر مجبور کیا تھا، اس نے انکار کیا تو اسے مینار پر لے جا کر پھینک دیا گیا۔ کریملن کی عمارت سے نکلے تو سامنے عجائب گھر تھا، ہم نے دیکھا کہ اس کے ایک حصے میں اب قرآن کے مخطوطات دوبارہ

رکھے گئے ہیں، جس جگہ یہ رکھے گئے ہیں وہاں اللہ جل جلالہ کے الفاظ کندہ کیے گئے ہیں۔ یہ سب کچھ کمیونزم کی بربادی کے بعد ممکن ہوا ہے۔

اب ہم شہر میں ایک پرانی اور تاریخی مسجد میں چلے گئے، یہ مکمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، اب اسے نئے سرے سے تعمیر کیا جا رہا تھا، کمیونسٹوں کے دور میں یہ فیکٹری بنا دی گئی تھی۔ کمیونسٹ جب اس شہر میں داخل ہوئے تھے تو انہوں نے اس شہر کی تمام مساجد کو بالکل ملیا میٹ کر دیا تھا اور وہ مدارس کہ جہاں قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی وہاں انفرادی تعلیم کے سکول و کالج کھول دیے گئے، قرآن مجید اور دینی کتابیں جس جگہ سے شائع ہوتی تھیں اس پر پیس کو اور کتب کو جلا ڈالا گیا، جن مدرسوں کو برباد کیا گیا ان میں اس وقت سات ہزار طلباء زیر تعلیم تھے۔ تازان کافی بڑا اور انتہائی خوبصورت شہر ہے، دریائے وولگا کے کنارے آباد ہے کہ جس میں بحری جہاز چلتے ہیں، اس سے اوپر ”امورت“ اور ”جوفاش“ کی ریاستیں ہیں، دائیں جانب مشرق میں ہشکیریا کی ریاست ہے، جس کا دار الحکومت ”اوقا“ شہر ہے۔ اس سے اوپر ”سیر“ کا شہر ہے، اس شہر کے نام کی وجہ سے روس نے بحر الکاہل تک سارے علاقے کو ”سائبیریا“ کا نام دے دیا۔ یہ سارے علاقے تاتار مسلمانوں کے علاقے ہیں جہاں انہوں نے صدیوں حکومت کی ہے۔

تازان کے تاتاری مسلمانوں نے بتلایا کہ انقلاب کے بعد کمیونسٹوں نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا اور لاکھوں کو سائبیریا کی طرف پھینک دیا اور یہاں روسیوں کو لاسایا، لہذا اب تازان میں اور تازان کے اردگرد قصبات اور دیہات میں عددی طور پر روسی اکثریت میں ہیں۔

دریائے وولگا کی لہروں پر بحری جہاز میں:

تاتاری مسلمان بھائیوں کا اللہ بھلا کرے کہ انہوں نے ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا وگرنہ اتنے کم وقت میں ہم تازان کا ہر اہم مقام کیسے دیکھ سکتے تھے۔ اب میں نے ان ساتھیوں سے کہا کہ جیسے بھی ہو سکے ہمارے لیے ٹکٹ کا بندوبست کریں۔ انہوں نے کہا کہ ریل کا ٹکٹ نہیں ملتا تو آپ بحری جہاز میں چلے جائیں، آپ کا پروگرام بھی آسٹراخان تک کا ہے اور یہ

بھی آسٹراخان تک جاتا ہے..... میں نے کہا اور کیا چاہیے اگر اس کا ٹکٹ مل جائے۔ تو..... بہر حال ہم دریائے وولگا کے کنارے تازان بندرگاہ پر آگئے، بڑی محنت اور کئی گھنٹے کی تگ و دو کے بعد آخر کار ان نوجوانوں نے ہمارے لیے فٹ کلاس کے دو ٹکٹ حاصل کر لیے اور ہمیں جہاز کے اندر بٹھا دیا۔ میں نے ان بھائیوں کو اپنا ایڈریس دیا، شکر یہ بھی ادا کیا اور جو تحائف میرے پاس موجود تھے وہ بھی اصرار کے ساتھ ان کو دیے۔

۱۲ اگست کو رات کے گیارہ بج کر دس منٹ پر ہمارا جہاز روانہ ہوا، یہ چار منزلہ جہاز بالکل اسی طرح تھا جس طرح فائینو سٹار ہوٹل ہو۔ ہمیں ہمارے کمرے کی چابی دے دی گئی، اس میں دو بیڈ لگے ہوئے تھے، صوفے تھے، ٹیبل موجود تھا، نیچے قالین بچھا ہوا، سفید دھلی ہوئی چادریں اور تکیے ہمیں فراہم کر دیے گئے، ایئر کنڈیشنز کمراتھا، ریڈیو موجود، گرم اور سرد پانی کا بیسن موجود، استعمال کے برتن، کپڑے لٹکانے کے لیے الماری اور ٹینگر حاضر، شیشے کی کھڑکی موجود کہ جس سے دریا کا منظر دکھائی دے۔

جہاز میں دو ریستوران تھے جن میں تین وقت کھانا دیا جاتا تھا جبکہ صبح کا ناشتہ مفت تھا، کھانا بھی انتہائی اعلیٰ اور نفیس ہوتا تھا، جہاز میں نہانے کے لیے حمام اور کپڑوں کے لیے استری تک کی سہولت موجود تھی۔

لینن کے شہر میں:

رات ہم سو گئے، صبح اٹھے، ناشتہ کیا اور پھر ہمارا جہاز ”ستاریا مینا“ کے گاؤں کے پاس لنگر انداز ہوا، یہاں اس نے پانچ گھنٹے قیام کیا پھر چل دیا اور دن کے چار بجے ”اولیانسک“ شہر کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ یہاں اس کا قیام پانچ گھنٹے تھا لہذا ہم شہر میں چلے گئے، بڑا خوبصورت شہر ہے، خاص طور پر بندرگاہ سے جب لمبی سیڑھیاں چڑھ کر شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس منظر کے حسن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا..... ہم نے شہر میں مسجد ڈھونڈنا شروع کر دی، ایک ہی مسجد تھی سو ہم نے بھمڈ ڈھونڈ نکالی۔ عصر کا وقت تھا، ہم مسجد میں داخل ہوئے تو ایک بوڑھی ناتارین عورت موجود تھی، اب ہم نے وضو کیا، ظہر اور عصر کی دونوں

نمازیں پڑھیں۔ بوڑھی اماں ہمیں دیکھتی رہی اور ذکر کرتی رہی۔ نماز کے بعد ہم اس کے پاس بیٹھ گئے، اماں کا نام پوچھا تو اس نے کہا میرا نام اللہ کے رسول ﷺ کی والدہ کے نام پر آمنہ ہے، میں مسجد کی خادمہ اور محافظہ ہوں۔ میں نے پوچھا کہ اس شہر کا پرانا نام کیا تھا جو مسلمانوں کے دور میں تھا؟ تو اس نے کہا اس کا پرانا نام ”سمبر“ تھا چونکہ اس شہر میں لینن پیدا ہوا تھا اس لیے اس کے دادا کے نام پر اس کا نام ”اولیانسک“ رکھ دیا گیا ہے جبکہ اس کے دادا کا نام ”اولیانوف“ تھا۔ مسلمانوں کے احوال پوچھے تو اماں رو پڑی، کہنے لگی یہاں سب مسلمان تھے، مسجدیں بھی کافی تعداد میں تھیں، انقلاب کے بعد مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا اور جو باقی بچے انھیں نہ جانے کہاں کہاں چھینک دیا گیا اور پھر ان کے بہترین گھروں میں روسیوں کو بسا دیا گیا، اب یہاں روسیوں کی اکثریت ہے مسجد میں صرف ظہر اور عصر کی جماعت ہوتی ہے، چند نمازی ہوتے ہیں جب کہ خطبہ جمعہ میں یہ مسجد بھر جاتی ہے، اب یہ ایک ہی مسجد ہے۔ مسجد کے ایک کونے میں سٹیل کا مینارہ بنایا گیا ہے، اس کے اوپر بلال کا نشان ہے، اب یہ بلالی مینارہ مسجد کے اوپر نصب کر دیا جائے گا۔ یقین جانیے ان علاقوں میں گھومتے ہوئے قدم قدم پر افغان جہاد کی برکت و عظمت کا ایک نیا نقش نئے انداز سے میرے ذہن میں منقش ہو رہا تھا..... اولیانسک میں اب پھر بلال کا نقش بلند ہوگا..... دریائے وولگا کے اس شہر میں افغان جہاد کا ایک اور نقش نہیں ابھرا تو آخر اور کیا ہوا ہے؟

کوئٹہ شہر:

اگلے دن چودہ اگست کو جب پاکستان میں میرے ہم وطن یوم آزادی منارہے تھے تو میں غلام دنیا میں اپنی متاعِ گم گشتہ تلاش کرتا پھر رہا تھا، اس شہر کے کنارے جہاز نے ساڑھے چار گھنٹے رکننا تھا اور پھر ہم اس بڑے شہر کی سڑکوں پر مسجد کا پتا پوچھتے پھر رہے تھے جو کبھی مسجدوں کا شہر ہوا کرتا تھا آج وہاں ایک ہی مسجد تھی وہ بھی شہر سے بہت دور اور اس کا پتا بھی چلا تو بڑی تنگ و دو کے بعد۔ اس طرح کہ ایک روسی نوجوان نے کہا کہ میری بیوی تاتاری ہے اور میری ساس کو پتا ہوگا، وہ بھی میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ روسی کے یہ الفاظ سن کر کلیجہ

منہ کو آگیا، میں فوراً سمجھ گیا کہ مسلمان قتل ہو گئے، عورتیں بچ گئیں، اب وہ اسی طرح روسیوں کے گھروں میں ہیں جس طرح پاک و ہند کی تقسیم کے وقت سے لے کر اب تک ہزاروں مسلمان عورتیں ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں میں رہ گئی ہیں..... اور اب تو ستر سال گزرنے کے بعد ویسے ہی امتیاز ختم ہو چکا ہے، روسی سمجھتا ہے چونکہ میں روسی ہوں اس لیے عیسائی ہوں اور تاتاری سمجھتا ہے کہ میں چونکہ تاتاری ہوں اس لیے مسلمان ہوں، باقی نہ انھیں عیسائیت کا پتا ہے اور نہ انھیں اسلام کا۔

بہر حال وہ اپنی ساس سے پتا پوچھ کر آیا اور ہم مسجد کے قریب پہنچ گئے تھے مگر وہ اب بھی دور تھی، سر پر رومال رکھے ہوئے ایک بوڑھی تاتارین مسلمان عورت نے ہمیں بتایا کہ اب وہ زیادہ دور نہیں ہے مگر ہم کیا کرتے، وقت بہت بیت چکا تھا، اگر جہاز کھوجا تا تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جاتا، لہذا ناچار ہم اپنا یہ مشن درمیان میں ہی چھوڑ کر واپس جہاز میں آگئے۔

تفریح کے شیطانی مناظر اور ہم:

”کوئپشیب“ سے چلنے کے تھوڑی دیر بعد جہاز ایک ساحلی تفریحی مقام پر رکا، جہاز کے کپتان نے اعلان کیا کہ یہاں جہاز ڈیرا ڈھ گھنٹہ رکے گا۔ ہم دونوں ساتھی بھی اترے اور جنگل میں چلے گئے، وہاں گھوم پھر کر جب واپس جہاز میں آئے تو جہاز کے سب مردوں عورتوں اور بچوں نے کپڑے اتار رکھے تھے، نیکریں پہن رکھی تھیں، کوئی نہ رہا تھا، کوئی ساحل پر کھڑا تھا اور کوئی ریت پر جانوروں کی طرح لیٹ رہا تھا اور وہ شرمناک مناظر پیش کر رہے تھے کہ اللہ کی پناہ۔

خیر جہاز چل پڑا اور پھر ہم کھانا کھانے کے بعد چہل قدمی کرتے ہوئے جہاز کے پچھلے حصے کی طرف نکل گئے وہاں مرد اور عورتیں آفتابی غسل میں مصروف تھے، جسے ان کے ہاں (Sun Bath) کہا جاتا ہے۔ یہ شیطانی منظر دیکھتے ہی ہم جلدی سے واپس مڑے۔

دوسری جانب گئے تو نوجوان شراب پینے میں مصروف تھے، انھوں نے ہمیں بھی دعوت دی، ہم نے کہا ہمارا اسلام اجازت نہیں دیتا اور اجازت تو آپ کا مذہب بھی نہیں دیتا مگر

آپ کو پتہ ہی نہیں کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے ڈسکو ڈانس میں ہمیں شرکت کی دعوت دی، ہم نے کہا شراب جائز نہیں تو یہ مخلوط ڈانس کیسے جائز ہوگا؟ بہر حال وہ ہماری ان باتوں پر تعجب کر رہے تھے کہ یہ کیا مخلوق ہے اور کہاں سے آگئی ہے، جو نہ عورتوں سے بات چیت تک کرتی ہے نہ شراب پیتی ہے اور نہ ہمارے ساتھ ڈانس کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس موسم میں اکثر لوگ وولگا کا سفر ہی اس شیطانی تفریح کے لیے کرتے ہیں اور وولگا کا جو حسن ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، بعض جگہ تو یہ اس قدر چوڑا ہے کہ چوڑائی میں تا حد نگاہ پانی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، کہیں درمیان میں انتہائی خوبصورت شاداب چھوٹے چھوٹے جزیرے دکھائی دیتے ہیں، پھر جہاں دریا کے کنارے دکھائی دیتے ہیں تو وہ انتہائی شاداب اور گھنے ہیں، ٹھنڈی ہوائیں جہاز کو چھوتی ہیں، مرغابیاں اور پرندے دریا میں تیرتے اور اڑتے ہیں اور جہاز دریا میں اس قدر سکون سے چلتا ہے جیسا کہ وہ زمین پر کھڑا ہو، چل نہ رہا ہو۔

اللہ کی توفیق سے ہماری تفریح یہ تھی کہ ان مناظر میں ہمیں اپنا رب یاد آتا تھا، میرا بھائی فتح اللہ قرآن یاد کرتا تھا اور میں اپنا سفر نامہ لکھنے میں مصروف ہوتا تھا۔ جب کمرے سے باہر نکلتے تو ایک کونے میں بیٹھ کر قرآن کا حسن اور سنگھار جسے اللہ کے رسول ﷺ نے ”عروں القرآن“ (قرآن کی دہن) کہا ہے، اس کے چہرے سے نقاب اٹھاتے یعنی سورۃ الرحمن کی تلاوت کرتے اور اس سے ہمارے دلوں کو جو سرور، لطف اور فرحت ملتی تھی، اطمینان کی جو دولت ہاتھ آئی تھی خنزیر کھا کر، ام النجائب پی کر اور شیطانی ڈانس کرنے سے وہ بھلا کہاں مل سکتی ہے؟

یہاں مجھے حیرانی ہو رہی تھی ان والدین پر کہ جو اپنی اولاد کو یورپ کے جہنم میں محض پیٹ پوجا کے لیے بھیجنے کو بڑا بے تاب رہتے ہیں..... یہاں کون سلامت بچتا ہوگا، سوائے اس کے کہ جس پر میرا رب رحم فرمائے۔ ایڈز کی ماری اس قوم میں اگر کوئی جائے تو پختہ ایمان

والا تجارت کے ساتھ ساتھ داعی کی حیثیت سے جائے، اس کے علاوہ یہاں جانا اپنے آپ کو بلاکت میں ڈالنا ہے۔ یہ مناظر دیکھ کر میری سوچ اور مشورہ یورپ کے عاشقوں کے لیے بہر حال یہی ہے۔ مجھے تو اب جو فکر لاحق تھی وہ یہی تھی کہ میرے آباء کی بستیوں میں، دو لگا کے کنارے کون سی قوم آہی ہے، دو لگا کے مقدس کنارے اس سے کب پاک ہوں گے؟

”سرائے“ جو اب ”ساراتفوف“ ہے:

۱۵ اگست کو ایک بچے جہاز ایک ایسے شہر کے کنارے لنگر انداز ہوا جسے تاریخ اسلامی میں ”سرائے“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس شہر کی بنیاد چنگیز خان کے پوتے باتو بن جوچی خان نے رکھی تھی۔ باتو مسلمانوں سے بڑی شفقت اور رحم دلی سے پیش آتا تھا۔ باتو کے حصے میں تفقاس کے علاقے، داغستان، خوارزم، تازان اور روس کے کچھ علاقے بادشاہی میں بطور ورثہ آئے، اس کے بعد اس نے ماسکو پر قبضہ کیا ”کیف“ کو زیر نگیں کیا اور پھر پولینڈ تک جا پہنچا۔ باتو خان نے ”سرائے“ کو اپنا پایہ تخت بنایا، پھر جب باتو اور اس کا بیٹا بھی فوت ہو گیا تو باتو خان کا چچا برک خان باتو کی جگہ بادشاہ بنا۔ برک خان نے ۶۵۰ھ میں اسلام قبول کیا۔ وہ ابو المعالی ناصر الدین برک خان کہلایا..... اللہ کی قدرت ملاحظہ کیجیے کہ ایک جانب چنگیز کا پوتا بلاکو خان بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا رہا تھا اور دوسری جانب جو کہ برک خان چنگیز کی ہی اولاد تھا، وہ سرائے میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سلطنت کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ اس ”سرائے“ کا نام اب روسیوں نے ”ساراتفوف“ رکھ دیا ہے، اس شہر سے خاص طور پر مسلمانوں اور ان کی مسجدوں اور مدرسوں کا وجود مٹایا گیا ہے، صرف ایک مسجد ہے جو کہ بندرگاہ سے دس منٹ کے پیدل فاصلے پر ہے اور یہ بھی مکان خرید کر بنائی گئی ہے۔ اس مسجد میں اس کے خادم ایوب سے ملاقات ہوئی، وہ کہہ رہا تھا یہاں بھی صرف دو نمازیں باجماعت پڑھائی جاتی ہیں، ظہر اور عصر اور یہ بھی جمع کر کے ایک ہی وقت میں پڑھ لی جاتی ہیں، چند نمازی ہوتے ہیں جبکہ جمعہ میں ۵۰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔

باتو نے اس شہر کی بنیاد رکھی برک خان کے اس شہر میں کہ کبھی ماسکو جس کے زیر نگیں ہوا

کرنا تھا، یہ حالت دیکھ کر دل بڑا مغموم ہوا مگر اس غم کی دو ابا لآخر وہی نسخہ جہاد ہے کہ جس کی تاثیر سے برکہ خان کے وارث بھی آگاہ ہو چکے ہیں اور تیلیٹ کے پجاری بھی۔

وولگا گراڈ:

۱۶ اگست کو صبح کی نماز پڑھنے کے بعد جب کمرے سے باہر نکلے تو ہمارا جہاز ایک سرنگ میں کھڑا تھا، اس کے آگے بھی ایک جہاز کھڑا تھا، اب اس سرنگ کا اگلا دروازہ بند ہونا شروع ہو گیا اور پچھلا بھی اور پھر پانی نیچے اترنا شروع ہو گیا حتیٰ کہ ہم چالیس فٹ تک نیچے چلے گئے، اب سامنے کا دروازہ کھلا اور ہم اگلی سرنگ میں چلے گئے، وہاں تیس فٹ نیچے چلے گئے، اب جہاز چل پڑا، اوپر جو پل تھا اسے کراس کر لیا اور اسی پل کو کراس کرنے کے لیے انجینئرنگ کا یہ حیرت ناک عجوبہ بنایا گیا ہے۔ باقی مقامات پر تو پل کافی بلند تھے، وہاں سے جہاز گزر جاتا تھا، مگر یہاں یہ منصوبہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ پل اونچا نہیں ہے۔ جہاز یہاں سے گزر کر ایک گھنٹہ بعد وولگا گراڈ کے کنار جاگا۔ تازان اور اولیانسک بھی بڑے خوبصورت شہر تھے مگر اس شہر کی بندرگاہ اور پھر کنارے پر سیڑھیوں کی شکل میں لمبے لمبے پارک اور پھر شہر میں گئے تو وہ بھی ایسا ہی حسین تھا۔ غرض اس کا حسن بھی اپنی مثال آپ تھا، اس شہر کا نام سٹالن گراڈ رکھا گیا اور اب اسے بدل کر وولگا گراڈ رکھ دیا گیا ہے۔ کمیونسٹوں نے اس میں بھی کسی مسجد کا وجود باقی نہیں رہنے دیا، حال ہی میں جو مسجد بنی ہے وہ درگرا کے علاقے میں ہے، ہم ڈھونڈتے ہوئے اس میں پہنچے تو مسجد کے ساتھ قیام پذیر شامل صاحب سے ملاقات ہوئی، اس کے پاس چابیاں تھیں، اس نے مسجد کے تالے کھولے اور ہم مسجد میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ شامل صاحب نے بتایا کہ وہ روسی فوج میں ایک انسٹر کی حیثیت سے جلال آباد، لوگر اور دیگر کئی مقامات پر دو سال تک کام کرتا رہا ہے۔ شامل صاحب نے بتایا کہ میں اور میری بیوی مسجد کے خادم ہیں، اس لیے ہم مسجد کے ساتھ ہی رہتے ہیں جبکہ امام مسجد حمزہ صاحب ہیں جنہوں نے اوقاف میں سال ڈیڑھ سال تک تعلیم حاصل کی ہے اور اب وہ یہاں کافی دور ایک

گاؤں میں ہیں۔

میں نے شامل صاحب سے پوچھا کہ انقلاب سے قبل تو شہر میں کافی مسجدیں ہوں گی؟ کہنے لگا بہت مسجدیں تھیں۔ اردگرد دیہات میں بھی تھیں، مسلمانوں کی بھی اکثریت تھی مگر اب یہ ایک ہی مسجد ہے جو حال ہی میں بنائی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس مسجد میں بھی ظہر اور عصر کی دو نمازیں ہی ہوتی ہیں جبکہ جمعہ میں ۴۰-۵۰ آدمی ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اس مسجد سے نکلنے لگے تو اس نے ہمیں سورۃ الفاتحہ سنائی اور کہنے لگا کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو میرے دادا نے جو کہ امام مسجد ہوا کرتے تھے انہوں نے سکھائی تھی، بس یہی مجھے یاد رہ گئی اور کچھ نہیں آتا۔ اب ان شاء اللہ سیکھوں گا..... میں سوچ میں پڑ گیا کہ دادا نے تو پوتے کا نام شامل رکھا، اس امام شامل رضی اللہ عنہ کے نام پر جو کہ افغانستان میں روسیوں سے لڑتا رہا مگر وہی پوتا افغان مجاہدین کے خلاف افغانستان میں روسیوں کے ہم رکاب رہا..... تو یہ ہے وہ انتقام جو روسی صلیبیوں نے مسلمانوں سے لیا ہے..... یقین جانیے اس کا قرض مسلمانوں کے سروں پر ہے اور جہاد کی بے شمار قسطوں میں سے ابھی تو ہم نے پہلی قسط کا ہی قرض اتارا ہے، وہ افغانستان میں اترا ہے جبکہ بقیہ اقساط اسی طرح موجود ہیں، دو لگا کا کنارہ اس بات کی دہائی دے رہا ہے۔

آسٹراخان:

۱۷ اگست کو صبح ساڑھے دس بجے آسٹراخان پہنچے۔ قازان سے آسٹراخان تک ہمارا سفر پانچ دنوں میں مکمل ہوا، یہ سارا علاقہ یورپ میں ہے اور انتہائی اہم ہے، جس کے پاس یہ ہو اس کی زد میں ایک طرف ترکستان یعنی وسط ایشیا کی پانچ ریاستیں ہوتی ہیں، دوسری طرف آسٹراخان سے آگے بحر قزوین اور بحیرہ اسود کے درمیانی ممالک جو کہ سارے کے سارے مسلمانوں کے علاقے ہیں، یہ بھی اس کی دسترس میں ہوتے ہیں اور روس کہ جس کا دار الحکومت ماسکو ہے وہ بھی ان سے دور نہیں ہوگا کہ جن کا قبضہ وولگا پر ہوگا..... یہی وجہ ہے کہ روسی بادشاہوں نے بھی سب سے پہلے وولگا پر قبضہ کیا اور پھر کمیونسٹوں نے بھی اس دریا کے کنارے وہ ظلم ڈھائے، وہ قتل عام کیا کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ دریائے وولگا کے

کنارے آباد شہر اور دیہات کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی آج وہاں روسیوں کی اکثریت ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر روسی کہاں سے آگئے حالانکہ ان کی شرح پیدائش مسلمانوں سے انتہائی کم ہے، سبب ظاہر ہے، روسیوں نے مسلمانوں کا قتل عام ہی اس قدر زیادہ کیا ہے کہ روسی تعداد میں ان سے بڑھ گئے۔

شہر آستراخان کے نام پر اس ریاست کا نام بھی آستراخان ہے، اس کی بندرگاہ پر پہنچتے ہی ہم نے ٹیکسی پکڑی اور ایک مسلمان بھائی محمد کے گھر جا پہنچے، وہ باہر نکلے تو ہم نے السلام علیکم کہا اور پھر ہم ایسے بغلگیر ہوئے جیسے برسوں کی جدائی کے بعد باہم ملے ہوں اور ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ بھائی محمد صاحب کتاب وسنت کے حامل، صحیح العقیدہ نوجوان عالم دین ہیں، باہمی تعارف کے بعد کھانا کھلایا، نماز پڑھی اور پھر ہم آستراخان دیکھنے کو نکلے۔ شہر میں روسیوں کی اکثریت ہے۔ دوسرے نمبر پر تاتاری اور تیسرے نمبر پر تازق مسلمان ہیں۔ ہمیں بتلایا گیا کہ اس شہر میں ہر محلے میں مسجد تھی، مدرسے تھے مگر روسیوں نے ان کا وجود ہی ختم کر دیا، اب پانچ مسجدیں باقی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ہم پہلی مسجد میں گئے، یہ حال ہی میں واگزار ہوئی ہے، اس کی مرمت کا کام ہو رہا تھا..... شہر کے وسط میں ایک مسجد دیکھنے گئے، یہ کافی بڑی مسجد تھی مگر اس کی چھت اور دروازے جلے ہوئے تھے، آگ سے دیواریں سیاہ تھیں اور جگہ جگہ سے مسجد کو توڑا پھوڑا گیا تھا، اس مسجد کے ساتھ تین منزلہ ایک کافی بڑی بلڈنگ تھی، ہمیں بتلایا گیا کہ یہ مدرسہ تھا جو مسجد کے ساتھ ملحق تھا مگر اسے کمیونسٹوں نے مینٹل ہسپتال بنا ڈالا، یہ آج بھی پاگل خانہ ہے۔ کمیونزم کے پاگل پن پر مبنی نظریہ تو مر گیا اور اسی پاگل پن کی وہ بھیئت چڑھا مگر اب پاگلوں کو سبق سکھانے کے لیے اسے دوبارہ مرکز علم و دانش بنانے کے لیے اولوالباب (صاحب عقل و خرد) اس مدرسے تک کب پہنچیں گے، یہ مدرسہ سراپا سوال ہے؟

صاحب علم و دانش کہلانے والے مسلمانوں کے مدرسہ اقتدار اور لیڈر حضرات کو نصف صدی ہونے کو آئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے اقوام متحدہ کے دورازے

پر انصاف کی بھیک مانگتے رہے، فلسطین کو لینے کے لیے کاسنہ گدائی پھیلاتے رہے، کشمیر کے لیے اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے، مگر انھیں کچھ بھی تو نہ ملا۔ افغانیوں نے یہ کام کیا کہ جہاد کے راستے پر چل کھڑے ہوئے اور پھر دنیا بھر کے مجاہد اور مخلص مسلمان ان کے ہم رکاب ہو گئے..... اور پھر افغانستان کا مسئلہ ایسا حل ہوا کہ اس کے ساتھ ازبکستان، ترکمانستان، تاجکستان، کرغستان، آذربائیجان اور چیچنیا کا مسئلہ بھی قدرے حل ہو گیا اور ابھی مزید مسائل حل ہونے والے ہیں اور (ان شاء اللہ) کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس راستے پر چلتے رہیں، وہ راستہ کہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ یہی عقل و دانش کا راستہ ہے اور یہ کہ اسے اپنانے والے صاحب خرد لوگ تھے، اولوالالباب تھے، مسلمانوں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔

مسجد میں مولویوں کی تصاویر:

اب ہم آسٹراخان کی مرکزی اور سب سے خوبصورت مسجد میں گئے تو اس کے اندرونی دروازے پر روس کے مفتیوں اور مولویوں کی تصاویر ایک فریم میں لٹکانی ہوئی تھیں..... یہ تصاویر دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی اور اس سے بڑھ کر یہ حیرانی کہ سب نے کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ ٹائی لگا رکھی تھی جو کہ صلیب کا نشان ہے اور ہر عیسائی اسے گلے میں خوب کس کر ڈالتا ہے۔ یہ صاحب تصویر حضرات داڑھی منڈے تھے، چند ایک کی تھی اور وہ بھی انتہائی چھوٹی..... معلوم ہوا کہ روسیوں نے یہ مولوی اور مفتی خاص طور پر رکھے ہوئے تھے اور یہ مولوی بھی کمیونسٹ ہی ہیں جیسا کہ ماسکو کے امام صاحب کا تجربہ ہو چکا تھا..... مجھے بتایا گیا کہ آسٹراخان میں ایسے بھی مولوی صاحب ہیں کہ جمعہ کے دن لوگوں نے اسے کہا کہ جمعہ پرھائیں تو وہ گھر میں ہونے کے باوجود مسجد میں نہ آئے اور کہا وہ چھٹی پر ہیں، لوگوں نے کافی کہا مگر وہ نہ مانے اور کہا کہ جب میں نے اس روز کی حکومت سے چھٹی لے لی ہے تو اب آخر میں کیوں مسجد میں جاؤں؟

مزید معلوم ہوا کہ جو مسجدیں واگزار ہو رہی ہیں ان میں ایسے ہی مولوی اور امام ہیں

جو کہ روس کے حامی ہیں اور یہ مسجدیں حکومت کے تحت ہیں اور مزید ظلم کی بات یہ ہے کہ ان مسجدوں کی مرمت وغیرہ پر تو پچاسا عام مسلمان لگا رہے ہیں جبکہ مسلمانوں کو ان مسجدوں کا ٹیکس بھی حکومت کو دینا ہوتا ہے اور یہ ٹیکس روسی حکمرانوں نے لگا رکھا ہے۔

یہ حال تھا مسجدوں کا جبکہ آسٹراخان کا کریملن جو کہ شہر کے وسط میں کئی مربع اراضی میں ہے، اس میں عالی شان گرجے موجود تھے، ان کے میناروں پر سونے کی صلیبیں چمک رہی تھیں، آسٹراخان کا کریملن روسی سربرہ کے کنٹرول میں ہے اور روسیوں نے اسے براہ راست روس میں شامل کر رکھا ہے اور تاتارستان وہ صرف تازان اور اس کے نواحی علاقوں کو ہی کہتے ہیں اور وہ بھی روس میں شامل ہے۔ آسٹراخان کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بہت زیادہ ہے کہ یہاں آکر وولگا بحر قزوین میں گرتا ہے، جسے بحر خزر بھی کہتے ہیں۔ تو یوں آسٹراخان دریائے وولگا اور بحر قزوین کے کنارے آباد مسلمانوں کا ایک تاریخی شہر ہے کہ جس کے ایک جانب ترکستان اور دوسری جانب قفقاس کے ممالک ہیں۔

روسی نو مسلم عبدالفتاح سے ملاقات:

بھائی محمد صاحب جو کہ عالم دین ہیں، عربی بڑی اچھی اور روانی سے بولتے ہیں، انفرادی طور پر اپنے گھر میں ہی نوجوانوں کو پڑھاتے ہیں۔ عصر کے وقت پانچ چھ نوجوان اکٹھے ہو گئے، ان میں ایک تازق تھا، ایک تاتاری اور ایک داغستانی تھا..... روسی نو مسلم ابھی نہیں آیا تھا، سو وہ بھی آ گیا..... محمد صاحب نے مجھے بتلایا کہ یہ ہمارے روسی بھائی ہیں، ان کا نام عبدالفتاح ہے۔ ۲۲، ۲۳ سال عمر، پوری داڑھی، لمبے قد کے خوبصورت نوجوان ہیں، دسترخوان پر بیٹھے ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ہمارا یہ بھائی چچے اور کانے کو ایک طرف رکھ کر دائیں ہاتھ سے سویاں کھانے لگا، سنت سے تو اسے کمال درجے کی محبت تھی۔ یہ نوجوان جو ”یلک“ سے عبدالفتاح بن چکا ہے، میں نے اس سے پوچھا اسلام نے آپ کو کیسے فتح کیا؟ وہ کہنے لگا میرے ذہن میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر اس دنیا میں میرا مقام کیا ہے؟ میرا مستقبل کیا ہے؟ میں کہاں سے آیا ہوں، کہاں جاؤں گا اور یہ کہ مجھے کیوں اور کس مقصد کے لیے اس

جہان میں پیدا کیا گیا اور یہ کہ مجھے اور اس جہاں کو پیدا کرنے والا میرا حقیقی خالق کون ہے؟ مجھے ان سوالات نے پریشان کر رکھا تھا اور میں ان کا کہیں بھی جواب نہیں پا رہا تھا، آخر کار میرے ہاتھ قرآن لگ گیا روسی زبان میں اس کا ترجمہ ایک یہودی مستشرق کراچ کو سکی نے کیا ہے، بس یہ قرآن پڑھنے سے میرے تمام سوالات کے جوابات مجھے مل گئے، قرآن نے مجھے فتح کر لیا تھا اور میں بھمد اللہ عبدالفتاح بن گیا۔ میرا اگلا سوال تھا قرآن کی کون سی سورت آپ کے اسلام کا باعث بنی اور اس نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟ تو عبدالفتاح کہنے لگا ویسے تو تیسویں پارے کی سورتوں نے میرے دل کو بلا ڈالا تاہم میرے اسلام کا باعث سب سے زیادہ جو سورت بنی وہ سورہٴ نجم ہے۔

عبدالفتاح کہنے لگے مجھے اللہ تعالیٰ نے غور و فکر کی نعمت سے نوازا ہے اور یہی میرے لیے قبول حقیقت کا باعث بن گئی اور اسلام جو سراسر حق اور حقیقت پر مبنی ہے اس سے ہدایت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں، اللہ کا بے پناہ شکر ہے کہ اس نے مجھے ہدایت سے نوازا۔

میرا آخری سوال تھا کہ آپ کے ماں باپ اور دیگر لوگ آپ کے لیے رکاوٹ تو بنے ہوں گے؟ انہوں نے کہا رکاوٹ تو بنے تھے، ظاہر ہے انہوں نے بنا تھا مگر جب انہوں نے میری ثابت قدمی دیکھی اور میرے دلائل کی قوت کے سامنے اپنی بے بسی ملاحظہ کی تو اب وہ خاموش ہو گئے ہیں۔

عبدالفتاح عربی زبان بولنے کی بھی کچھ استطاعت رکھتے ہیں، تاہم وہ بھائی محمد سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اب نماز کا وقت ہو گیا تھا، عبدالفتاح سنتیں پڑھنے میں مصروف ہو گیا، بخاری و مسلم کے مطابق رفع الیدین اور خشوع و خضوع اس کا دیدنی تھا۔ تین دن ہم اپنے ان بھائیوں کے پاس رہے، جمعہ بھی یہاں ادا کیا، چالیس کے قریب نوجوان تھے جو کتاب و سنت کے حامل اور صحیح العقیدہ مسلمان تھے..... یہاں اپنے ان بھائیوں سے فارغ ہوئے تو اب ہماری اگلے سفر

کے لیے تیاری تھی، گھر سے نکل کر سڑک پر آئے تو روپی لڑکیاں معروف عریاں لباس میں جا رہی تھیں، عبدالفتاح کی نظر پڑی تو فوراً دوسری طرف گھومے، نگاہ کو پلٹا اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اف یہ کفار..... کہ ان کی غلاظت سے کب جان چھوٹے گی۔ عربی میں یہ جملے عبدالفتاح کی زبان سے بڑے ہی پیارے لگ رہے تھے، اب ہم دونوں بھائی بغلگیر ہوئے کہ اللہ کو منظور ہوا تو دوبارہ (ان شاء اللہ) ملاقات ہوگی اور پھر آسترخان کے سٹیشن کی طرف چل دیے، جسم تو الگ الگ ہو گئے مگر عقیدہ و ایمان کی بنیاد پر ہمارے دل ایک تھے جو اللہ کے فضل سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے ایک ہیں، ستر سالہ الخاد کا پردہ انھیں چاک نہیں کر سکا۔ کیسا بابرکت ثابت ہوا ہے افغانستان کا جہاد کہ جس نے آج وصل کا یہ موقع بھی دیکھنے کو دیا..... (الحمد للہ)



کوہ قاف کی طرف امام شامل کے دیس داغستان میں

چیچنیا میں چودہ گھنٹے:

رات ساڑھے سات بجے ریل گاڑی پر آسٹراخان سے روانہ ہوئے اور جنگلات کا سفر طے کرتے ہوئے صبح سات بجے چیچنیا کے سٹیشن ”کوورمیس“ پر پہنچے۔ چیچن اور انگیشیا دراصل شمالی قفقاز کی دو ریاستوں کے نام ہیں، چیچن اور انگیشیا دونوں قبیلوں کے نام پر ان ریاستوں کو ایک ہی کر دیا گیا ہے۔ عربی میں اس ریاست کو ”شاشان الغوش“ کہتے ہیں..... اب ہم اس علاقے میں داخل ہو گئے ہیں جو ہماری پاکستانی کہانیوں میں پریوں کا علاقہ کہلاتا ہے اور اگر انتہائی دوری، بعد اور راستوں کے اعتبار سے مشکل علاقہ کا ذکر کرنا ہو تو کوہ قاف کا نام لیا جاتا ہے۔ کوہ قاف، قوقاز، قفقاز اور قفقاس دراصل ایک ہی علاقے کے مختلف نام ہیں جو کہ بحر قزوین اور بحر اسود کے درمیان ہے یہ وہ علاقہ ہے کہ جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام کا پیغام پہنچ گیا تھا..... روسی بادشاہوں نے جب اس علاقے پر قبضہ کرنا چاہا تو شیخ محمد شامل رضی اللہ عنہ نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں ۲۵ سال تک جہاد کیا، شاشانیوں نے شیخ کا بھرپور ساتھ دیا۔ بعد میں جب کمیونسٹوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا تو انھوں نے سائن کے دور میں شاشانیوں کا خوب قتل عام کیا اور جہاد میں شیخ شامل رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے کے جرم میں ان کی بہت بڑی تعداد کو سائبیریا میں پھینک دیا۔ چیچن الغوش کا شہر کوورمیس جو کہ درمیانے درجے کا شہر ہے، ہم نے اس شہر کی مرکزی مسجد میں ظہر

کی نماز ادا کی، مسجد میں بیس کے قریب نمازی تھے، نماز کے بعد تعارف ہوا لوگ بڑی محبت سے ملے، امام مسجد جن کا نام محمود تھا انھوں نے کھانے کی دعوت دی مگر ہمارے کھانے کی مہر سلطان کے دامنا پانی پر لگی ہوئی تھی۔ لہذا ہم ان کے گھر پہنچ گئے، سب گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا کہ ہمارے گھر وہ شخص مہمان ہے جو کہ پاکستانی ہے، عربی بولتا ہے اور افغانستان میں جہاد کرتا رہا ہے۔ جب ہم دسترخوان پر بیٹھے تو کھانے میں کچھ دیر تھی، لہذا ستر سال سے قرآن کا چہرہ نہ دیکھنے والوں نے اب مجھ سے مطالبہ کیا کہ ہمیں قرآن سناؤ۔ اب صورتحال یہ تھی کہ میں قرآن کی تلاوت کر رہا تھا اور سب گھر والے محبت و مسرت سے سن رہے تھے۔ ستر سال تک نہ انھیں کسی نے قرآن دیکھنے دیا، نہ سننے دیا، نہ پڑھنے دیا، نہ باہر کے مسلمان بھائیوں سے رابطہ کرنے دیا اور اب جہاد کی ضربوں نے ان پر پابندیوں اور کمیونزم کی زنجیروں کو توڑا ہے تو صورتحال یہ ہے کہ دین کے ان پیاسوں کو کوئی پانی پلانے والا نہیں، مسجد کا امام اس لیے امام ہے کہ اسے دو چار سورتیں آتی ہیں اور بس۔

سلطان صاحب نے مجھے بتلایا کہ سٹالن کے دور میں روسیوں نے یہاں کے مسلمانوں سے ٹرین کو بھرا، کسی اور جگہ پھینک دیا اور دوسری جگہوں سے مسلمانوں کو اٹھایا اور یہاں پھینک دیا۔ انھوں نے کہا کہ کرغستان سے ہمیں گاڑی میں مویشیوں کی طرح بھرا گیا اور نو دن ہم گاڑی ہی میں رہے۔ اس دوران جو مر جاتا اسے گاڑی سے اس کے پیاروں کے سامنے اس طرح باہر پھینک دیا جاتا جس طرح کسی جانور کو مرنے پر پھینک دیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا یہاں چیچنیا میں علماء بڑی تعداد میں تھے، ان خالموں نے سب کو قطار میں کھڑا کر کے قتل کر دیا۔ شہر کی مسجد جو کہ بڑی خوبصورت مسجد تھی انھوں نے بتلایا کہ یہ چند سال قبل ہی بنائی گئی ہے، جمعہ کے دن یہاں ڈیڑھ ہزار نمازی ہوتے ہیں۔ انھوں نے مزید بتلایا کہ اب ہمارے نوجوان ابخازیا میں جہاد کے لیے بھی جا رہے ہیں کیونکہ تفقاز میں جارجیا کے عیسائی صدر گمسا خور دیا نے بحر اسود کے کنارے چھوٹی سی مسلمان ریاست پر چڑھائی کر دی

ہے، جب ہم نے آزادی حاصل کی تو ابخازیا کے مسلمان ہماری مدد کو آئے تھے اور پھر چینیا کے لوگوں نے ہتھیار اٹھالیے تھے اور روسیوں سے کہا کہ اگر تم ہمیں آزادی نہیں دو گے تو جہاد شروع کر دیں گے، لہذا ہم نے آزادی حاصل کی تو اب ہمارے لوگوں پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کریں اور یہاں کے سب علاقوں کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ عیسائیوں کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

شاشان کا دارالحکومت گروزنی ہے، گروزنی روسی بادشاہ تھا جس نے یہ شہر آباد کیا، یہاں روسیوں کی اکثریت ہے، عمومی طور پر اس ریاست میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ ریاست اب آزاد ہے، شافعی المسلک لوگوں کی کثیر تعداد ہے۔ شاشان کے صدر ”جوہر داؤد“ مسلمان ہے، اس نے قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرے گا۔ ۱۹۹۲ء کے شروع میں اس ریاست نے آزادی حاصل کی ہے۔

داغستان:

”داغستان“ ترکی اور فارسی زبان کا مرکب ہے، جس کا معنی ”پہاڑی علاقہ“ ہے۔ شیخ شامل بذیلہ اسی داغستان کے باشندے تھے۔ آسٹراخان میں مجھے شیخ بہاؤ الدین کے پاس پہنچنا تھا، لہذا ہم دونوں ساتھی ڈیرہ گھنٹے کے سفر کے بعد ریل کے ذریعے ”کزیلی پور تھ“ میں تھے، شیخ کے گھر پہنچے مگر وہ موجود نہیں تھے، وہ دعوت کے لیے دور دراز علاقوں کے سفر کے لیے ایک روز قبل گھر سے نکلے تھے۔ شیخ کے دو بیٹے بارہ سالہ ہارون اور اس سے چھوٹا موسیٰ آئے، ان کی والدہ بھی آگئیں، گھر بٹھایا، شیخ کا کتب خانہ دیکھا۔ یہ تھا تو چھوٹا سا ہی مگر اس علاقے میں یہ بہت بڑا تھا، شیخ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابوں کے یہاں کئی مسودے پڑے تھے۔ علم نحو پر انھوں نے کتاب لکھی، اس کی نوٹو سٹیٹ کروا کر ۲۵-۳۰ جلدیں تیار کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتابیں شیخ اپنے شاگردوں کو پڑھاتے ہیں۔ روسی زبان میں ترجمے کے ساتھ انھوں نے نماز کے لیے اب ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے، یہ چھپ چکی ہے۔ ہارون نے

اس کا ایک نسخہ مجھے دیا۔ عربی میں دعائیں پڑھ کر پتا چلا کہ اس میں نماز کا طریقہ اسی طرح لکھا ہے جس طرح اللہ کے رسول ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے اور وہ طریقہ امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔

شیخ بہاؤ الدین جن کی عمر ۴۵ سال ہے اور وہ آسٹراخان کے نوجوان عالم محمد کے بھی استاد ہیں، انھوں نے کیونزم کے دور جبر و تشدد میں یہ علم کہاں سے اور کس سے حاصل کیا؟ جبکہ کیونسٹوں نے علماء کی کثیر تعداد کو قتل کر دیا، کتب خانے، مدرسے اور مسجدیں ڈھا دیں اور دین حاصل کرنا گردن زدنی جرم تھا۔ شیخ کے گھر والوں نے بتلایا کہ انھوں نے اپنے باپ سے علم حاصل کیا، وہ امام مسجد تھے اور عالم تھے، گھر میں ہی باپ نے اپنے بیٹے کو اپنا علم منتقل کر دیا پھر بیٹے نے مطالعے اور جستجو سے اس قدر حاصل کیا کہ وہ باپ سے بھی آگے نکل گئے۔ شیخ کے گھر کھانا کھایا، ان کے نام خط لکھا اور پھر موسیٰ اور ہارون کو ان کی والدہ نے ہمارے ساتھ بھیج دیا اور ہم شیخ کے مدرسے میں آگئے۔

مدرسۃ الحکمہ میں استاد اور شاگردوں سے ملاقات:

چھ سات ایکڑ میں پھیلا ہوا یہ مدرسہ کہ جس کی عظیم الشان دو منزلہ عمارت کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، اس کے بارے میں طلباء نے بتلایا کہ یہ پہلے زسری سکول تھا، حکومت نے اسے بیچنا چاہا تو شیخ نے اسے خریدنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں، ہمارے مخالفین جو کہ ہمیں کتاب و سنت کا قلع ہونے کی بناء پر وہابی کے نام سے مطعون کرتے ہیں، انھوں نے بڑی مخالفت کی۔ اب حکومت نے ان سے کہا کہ تم اس کی رقم دے دو ہم تمہیں دے دیتے ہیں اور حکومت بھی انہیں ہی دینا چاہتی تھی مگر ہم نے بھاگ دوڑ کر کے اللہ کی توفیق سے پیسے اکٹھے کر لیے، لہذا حکومت کو ہمیں ہی یہ مدرسہ دینا پڑا۔ اب سو داٹے ہونے کے بعد پھر حکومت پر دباؤ پڑا تو اس نے لیت و لعل سے کام لیتا شروع کر دیا مگر ادھر ہم بھی خاموش بیٹھنے والے نہ تھے لہذا اللہ نے مدد کی اور یہ مدرسہ ہمیں مل گیا اور یہاں ڈیڑھ صد کے قریب طلباء زیر تعلیم

ہیں، آدھے ٹیچن سے ہیں اور آدھے داغستان سے، آذربائیجان سے بھی ہیں اور قازان کا ایک طالب علم بھی یہاں موجود تھا۔

مدرسے میں ان دنوں چھٹیاں تھیں مگر اس کے باوجود سات آٹھ کے قریب طلباء یہاں موجود تھے، ان طلباء نے جو محبت بھرا سلوک ہمارے ساتھ کیا وہ کبھی نہیں بھولے گا۔ طلباء نے بتلایا کہ تفقاز کے سارے علاقوں کی نسبت چیچنیا اور داغستان میں اسلامی بیداری کی لہر زیادہ ہے جبکہ ان دونوں میں پہلے نمبر پر داغستان ہے۔ مدرسہ جس کو شروع ہوئے چھ ماہ ہوئے ہیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ طلباء عربی میں گفتگو کر لیتے تھے۔

اس مدرسے میں کل تین اساتذہ ہیں، ایک تو شیخ بہاؤ الدین خود ہیں جن کی نگرانی میں یہ مدرسہ تعلیم اور دعوت کا مرکز ہے، دوسرے مصر سے جامعۃ الازہر کے فارغ شیخ سعد مصری ہیں۔ دو طالب علموں نے شیخ کو ان کے گھر جا کر ہمارے آنے کی اطلاع دی، وہ فوراً مدرسے میں تشریف لے آئے، انھوں نے کہا یہ سارا علاقہ دین کا پیاسا ہے مگر علماء اور داعیوں کی کمی ہے، انھوں نے کہا اللہ نے مجھے توفیق دی یہاں خدمت بجالا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا لڑکیاں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں مگر فی الحال کوئی بندوبست نہیں جبکہ مدرسۃ البنات کی اشد ضرورت ہے۔ تیسرے استاد عبدالب صاحب ہیں جن سے لوگ مسائل دریافت کرتے ہیں یعنی افتاء کا کام ان کے حوالے ہے۔

شیخ نے اب ۲۰ کلومیٹر دور ایک گاؤں میں دعوت کے سلسلے میں جانا تھا، مجھ سے رخصت ہوئے اور انھوں نے بتلایا کہ ہم اسی طرح چھٹیوں میں اور تدریس کے دوران فارغ اوقات میں دیہات وغیرہ کے اندر دعوت میں مصروف ہو جاتے ہیں اور یہ ہمارے شاگرد ترجمان کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

آذربائیجان میں دل آزار لہجات:

رات گیارہ بجے مدرسے کے طلباء نے ہمیں گاڑی میں بٹھا کر الوداع کیا، گھنٹہ بھر چلنے

کے بعد افغانستان کا دارالحکومت ”منج قلعه“ آ گیا، بحر قزوین کے کنارے یہ شہر آباد ہے اور ہمارا سفر بھی بحر قزوین کے کنارے کنارے ہی ہے کہ دائیں طرف پہاڑ ہیں اور بائیں طرف بحر قزوین۔ گیارہ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم آذربائیجان کے دارالحکومت ”باکو“ شہر میں تھے۔ باکو بحر قزوین کے کنارے جزیرہ نما شہر ہے۔

ہم سٹیشن سے سیدھے بندرگاہ پر پہنچے، ہمارا پروگرام یہ تھا کہ باکو سے بحری جہاز کے ذریعے ترکمانستان اور وہاں سے ازبکستان چلے جائیں گے، یہ مختصر راستہ تھا مگر یہ ہمیں بہت مہنگا پڑا۔ بندرگاہ سے پتا چلا کہ جہاز آج جائے گا یا کل، یہ اطلاع پانچ بجے ملے گی۔ اب ہمارے پاس سات آٹھ گھنٹے تھے، لہذا ہم مسجد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، بحر قزوین کے کنارے گھنے درختوں والے پارکوں کا منظر بڑا خوبصورت تھا، ایوان صدر ہمارے بائیں جانب تھا اور ہم مرکزی سڑک پر لوگوں سے مسجد کا پتا پوچھ رہے تھے، سڑک کے کنارے پولیس کی گاڑی کھڑی تھی، گزرتے ہوئے بھائی فتح اللہ نے پولیس اہلکار سے مسجد کا پتا پوچھ لیا، اس نے کہا تم کہاں سے آئے ہو اور پھر سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی جبکہ فتح اللہ کے پاس اسے دیکھانے کے لیے نہ کوئی پاسپورٹ تھا اور نہ ہی شناختی کارڈ تھا۔ اب ان تین چار پولیس والوں نے ہمیں گاڑی کے اندر بٹھالیا اور میرے کاغذات چیک کرنے شروع کر دیے جبکہ میرا ویزا تو فقط ازبکستان کا تھا اور وہاں بھی فقط تین شہروں تاشقند، سمرقند اور بخارا کے لیے اور پھر اس ویزے کی مدت ختم ہوئے بھی آج چار دن ہو چکے تھے، لہذا اب فتح اللہ جیل میں جائے گا اور امیر حمزہ پاکستان کے سفارت خانے میں۔ اب گاڑی چل چکی تھی، شہر میں گھومتی رہی اور وہ ہم سے باتوں میں مصروف رہے۔ کچھ دیر بعد وہ کہنے لگے کہ امیر حمزہ آزاد ہے، یہ جاسکتا ہے مگر فتح اللہ نہیں جاسکتا، یہ تو جیل جائے گا۔ میں نے کہا میں اپنے ساتھی کو چھوڑ کر کیسے جاؤں، یہ نہیں ہو سکتا اور فتح اللہ نے انہیں کہا کہ دیکھو..... یہ مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے یہاں آئے ہیں اور تم یہ سلوک کر رہے ہو۔ تو پھر اچھا تم ہمارے ساتھ کچھ بھی نہیں

کر سکتے الا یہ کہ ہمارا اللہ جو چاہے۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا مگر حسب عادت کہ جو پولیس کی ہوا کرتی ہے یعنی ہمارا سامان دیکھ کر ہم سے جو لوٹنا چاہا انہوں نے لوٹ لیا۔ پولیس کی گاڑی میں کرب آمیز لمحات میں ہم نے اپنے اللہ سے دعائیں کیں اور اس مالک نے ہمیں ان سے نجات دی، اب ہم نے پھر مسجد کی تلاش شروع کر دی، ایک ٹیکسی والے سے کہا کہ وہ ہمیں مسجد میں لے چلے۔ وہ ایک جگہ ہمیں لے کر پہنچا اور ہم مسجد میں داخل ہوئے تو وہ شیعہ حضرات کی امام بارگاہ تھی، شرک کے وہاں مناظر تھے، فتح اللہ نے یہ سارا کچھ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا، وہ گھبرا اٹھا، کہنے لگا یہ کیسی مسجد ہے اور یہ کون لوگ ہیں؟ چنانچہ ہم یہاں سے تو باہر نکل آئے جبکہ فتح اللہ کو مجھے اچھا خاصا لیکچر دینا پڑا..... باکو شہر میں اب ہم نے مسجد کی تلاش تو چھوڑ دی کیونکہ جگہ جگہ پولیس اور زبردست تفتیش جاری تھی، شاید یہ اس قدر آذربائیجان کی آرمییا کے ساتھ جنگ کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ ایک آذربائیجانی عورت نے ہمیں بتلایا کہ حال ہی میں چار سو آذربائیجانی قتل ہو گئے ہیں اور یہ کہ مزید نو جوان بھرتی کئے جا رہے ہیں، جنگ تیز ہو رہی ہے۔ آذربائیجان میں اکثریت شیعہ حضرات کی ہے، دیہات میں اہل سنت کافی تعداد میں ہیں۔ باکو میں سنا تھا کہ ایک مسجد ہے مگر تلاش کرنے میں ہم تو ناکام رہے پھر جو پانچ بجے بندرگاہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج جہاز نہیں جائے گا، اب ہمیں فکر و منگیر ہوا کہ کل تک انتظار تو تب کریں جب ہمیں نکل مل جائے اور جب اس کا پتا کیا تو معلوم ہوا کہ پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہذا اب ہم یہاں سے سٹیشن کی طرف بھاگے، وہاں سے گاڑی پکڑی اور ۶ گھنٹوں کا سفر کرنے کے بعد دوبارہ آسٹراخان پہنچے۔



قازقستان، ترکمانستان، بخارا اور سمرقند کی قلم بند یادیں

آسٹراخان میں دوبارہ بھائی محمد کے پاس کچھ وقت گزارا اور پھر ۲۲ اگست کو ایک بکے ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ آسٹراخان سے تاشقند کے لیے روزانہ ایک ہی ٹرین جاتی ہے اور یہ ڈاک ٹرین ہے جو کہ تین دن میں تاشقند پہنچتی ہے، ٹرین کی بوگیاں بھی پانچ چھ سے زائد نہیں ہوتیں، بسیار کوشش کے باوجود ہمیں اس کا ٹکٹ نہ مل سکا، تھک ہار کر ٹرین کے پاس کھڑے تھے کہ بھائی محمد نے ڈاک کے ایک آفیسر سے بات کی۔۔۔ باتوں باتوں میں یہ آفیسر ازبکستان کے شہر ”اندجان“ کا باسی نکلا، تب میرے ہم سفر ساتھی کی اس حوالے سے اس سے آشنائی ہوگی کہ فتح اللہ تو ”اندجان“ میں زیر تعلیم ہے اور جس توحید سے منور مدرسے میں وہ زیر تعلیم ہے، ڈاک کا آفیسر اسی مدرسے کی مسجد کا نمازی ہے۔ اب جب میرا تعارف کرایا گیا تو ڈاک کے اس آفیسر نے اپنی بوگی میں سیشنل کیبن ہمارے لیے مخصوص کر دیا۔ یہ خالص اللہ کا کرم تھا جو ہم پر ہوا کہ دوران سفر یہ لوگ کھانا تیار کرتے اور جب دسترخوان پر سجالیتے تو ہمیں بلا لیتے۔ ۲۲ اگست کا دن گاڑی میں یوں گزرا کہ آسٹراخان سے ایک بکے چلے، تقریباً آدھ گھنٹہ بعد ”قازقستان“ کا بے آب و گیاہ جنگل شروع ہو گیا، کبھی چھوٹی موٹی جھاڑیاں شروع ہو جاتیں اور کبھی ریگستان میں گاڑی دوڑ رہی ہوتی۔ اب رات بھی بیت چکی تھی، فجر کی نماز کے بعد دسترخوان پر بیٹھ چکے تھے۔ میں نے ڈاک آفیسر سے کہا کہ چونکہ یہ گاڑی بخارا اور سمرقند سے ہو کر تاشقند جائے گی اور بجائے اس کے کہ میں تاشقند سے دوبارہ واپس ان شہروں میں آؤں، کیوں نہ بخارای میں اتر جاؤں۔ اس پر ڈاک آفیسر نے ہمیں

مشورہ دیا کہ ایک گھنٹے کے بعد تازقستان کا شہر ”بی نیو“ آ رہا ہے، آپ یہاں اتر جائیں، چار گھنٹے یہاں گھومیں پھیریں اور آرام کریں اور پھر ماسکو سے ایکسپریس ٹرین آئے گی اس میں سوار ہو جائیں اور اگلے دن صبح بخارا پہنچ جائیں، سارا دن شہر دیکھیں تب تک شام کو ہماری گاڑی بھی بخارا کے سٹیشن پر ہوگی۔ اب آپ ہمارے ساتھ پھر سے سوار ہو جائیں اور اگلے روز صبح کے وقت سمرقند اتر جائیں۔۔۔ بڑی زبردست تجویز تھی۔ چنانچہ ہم ۲۳ اگست کو صبح سات بجے تازقستان کے شہر ”بی نیو“ میں اتر گئے۔

جب ہم ”بی نیو“ میں امام مسجد کے مہمان بنے:

سٹیشن سے باہر نکلے..... یہاں قدرے سردی تھی، سورج کی شعائیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس شہر میں ہم نے مسجد کا پوچھا تو پتا چلا کہ مسجد کوئی نہیں ہے۔ امام مسجد کا معلوم کیا تو پتا چلا کہ امام مسجد موجود ہے۔ چنانچہ تلاش کرتے کرتے بالآخر آدھ گھنٹے بعد ہم امام مسجد کے گھر کے دروازے پر تھے۔

دروازے پر دستک دی تو ایک شخص باہر نکلا، بڑے تپاک سے ملا۔ مختصر سا تعارف ہوا تو اس نے اندر آنے کو کہا۔ میں نے سوچا امام مسجد اندر ہوں گے جبکہ یہ شخص تو کسی ورکشاپ کا ملینک ہے مگر یہ ملینک ہی دراصل امام مسجد تھا۔ وہ اپنی جیب درست کر رہا تھا، اب ہمیں بٹھا کر اس نے اپنے آپ کو درست کیا، جبہ و دستار پہنی۔ دسترخوان سج گیا اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ امام صاحب عربی جانتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے، بس سادہ قرآن پڑھے ہوئے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چند سورتیں یا دتھیں اور اسی تعلیم کی برکت سے وہ اس شہر کے امام مسجد تھے، وہ تعلیم کہ جو چھپ کر انھوں نے اپنے باپ سے حاصل کی تھی..... اب امام صاحب نے اپنی کتابوں کا خزانہ کہ جسے انھوں نے اور ان کے باپ نے بڑا چھپا کر رکھا ہوا تھا وہ سارا خزانہ میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔ یہ ترکی کی چھپی ہوئی حنفی مسلک کی کتابیں تھیں، عربی میں بھی تھیں اور ترکی زبان میں بھی۔ امام صاحب عربی کتابیں تو نہ پڑھ سکتے تھے جبکہ ترکی کتابوں سے

استفادہ کرتے تھے۔ اب جو میں نے ان بوسیدہ کتابوں کو دیکھنا شروع کیا تو ان میں نہ صرف یہ کہ کتاب و سنت کی مخالفت اور مقلدانہ باتوں کی بھرمار تھی بلکہ یہ شرک و بدعت سے بھی لبریز تھیں..... اب تو میں سرپکڑ کر بیٹھ گیا..... یا اللہ! ان لوگوں نے اس قدر خوف و دہشت کی حالت میں بھی دین کے نام پر یہ خزانہ سنبھال کر رکھا..... مگر یہ تو وہ خزانہ ہے جو ان پر رومی ملحدانہ آنتوں کا سبب بنا ہے۔ انھوں نے سنبھال کر رکھا بھی تو آخر کیا سنبھال کر رکھا، ستر سال قبل جس زنگ آلود لوہے کو انھوں نے سونا سمجھ کر سنبھال کے رکھا یہ آج بھی اسے سونا ہی خیال کیے ہوئے ہیں۔ میں غم و الم کی تصویر بنے یہ سوچے پلا جا رہا تھا کہ امام مسجد نے ایک کتاب کھولی اور اس کے صفحے پر بنا ہوا ایک ”لواء الحمد“ مجھے دکھلایا اور مجھ سے کہنے لگے کہ ہماری جو مسجد زیر تعمیر ہے اس میں یہ لواء الحمد لٹکانا چاہتا ہوں، اسے خوبصورت طریقے سے چھپوانے کا پروگرام ہے۔ امام مسجد جب خوشی کے ساتھ مجھے بتلا چکا تو میں نے کہا یہ تو ٹھیک ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ میں ”لواء الحمد“ یعنی حمد کا جھنڈا ہوگا مگر وہ کس طرح کا ہوگا، یہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں..... اور اب یہ جو اس کتاب میں جھنڈا بنا ہوا ہے اس کے چار کونوں پر خلفائے اربعہ کے اسمائے گرامی ہیں، درمیان میں کلمہ شہادت ہے تو یہ اختراع اس کتاب کے لکھنے والے کی ہے، لہذا آپ ایسی باتوں کو اور ان کتابوں کو چھوڑ دیں، دین قرآن و حدیث کا نام ہے اور آپ دین و ہیں سے حاصل کریں۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی وغیرہ جو حدیث کی کتابیں ہیں ان کا مطالعہ کریں، حنفیت اور شرک و بدعت سے بچیں..... بہر حال میں نے تقریباً گھنٹہ بھر امام صاحب کو سمجھایا..... بحمد اللہ انھوں نے میری ہر بات کو تسلیم کیا اور اب کتابوں کو باندھ کر ایک طرف رکھ دیا اور کہا کہ اب میں حدیث کی ترجمے والے کتابوں کو ڈھونڈوں گا اور انھیں سے دین حاصل کر کے اس علاقے میں پھیلاؤں گا اور پھر آہ بھر کر انھوں نے کہا کہ ان کتابوں کا حصول فی الوقت مشکل ہے۔ بہر حال میں نے امام صاحب کو کچھ ساتھیوں کے پتے دیے اور کہا کہ اپنے علاقے میں آپ

ان سے رابطہ کریں، ان شاء اللہ آپ کی راہ نمائی بھی ہوگی اور اہل توحید علماء کا آپس میں تعلق بھی قائم ہوگا۔

امام صاحب کہ جن کا نام کیئس بائی تھا ہم ان کے دسترخوان سے اٹھے تو انہوں نے مجھے تازقستانی طربوش (ٹوپی) اور گائے کے گھی کا ایک ڈبہ تحفے میں دیا اور اب ہم مسجد کی طرف چل دیے۔ مسجد ابھی زیر تعمیر تھی۔ امام صاحب نے بتلایا کہ روسی انقلاب سے قبل یہاں کئی مساجد تھیں پھر ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہی۔ اب دو سال قبل ہم نے جمعہ کی نماز شروع کی ہے اور یہ میرے گھر میں ہی ہوتی ہے۔ دو ہفتے بعد ہم ان شاء اللہ اپنی اس مسجد میں نماز شروع کر دیں گے..... میں نے امام صاحب سے کہا کہ یہ جو دو سال قبل آپ نے نماز اپنے گھر میں شروع کی اور اب مسجد بھی بن رہی ہے اور میں پاکستان سے یہاں آپ کے ہاں گفتگو کر رہا ہوں تو کیا آپ کو معلوم ہے یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا ہے۔ کہنے لگے ہاں! روس افغانستان میں مجاہدین کے ہاتھوں شکست کھا گیا ہے۔ اب میں نے امام صاحب کو کہا کہ جہاد افغانستان نے ”بی نیو“ میں اسلام پر جو دروازے بند تھے وہ وا کروا دیے..... تو اب آپ کا فرض ہے کہ توحید و جہاد کے انہیں زینوں کی طرف چڑھنا شروع کریں کہ جن کی کامیابی کا منظر آپ کو ”بی نیو“ میں بھی دکھائی دے رہا ہے۔

امام صاحب کی جیب میں شہر کی سیر کرتے ہوئے اب ہم سٹیشن پر آئے، تھوڑی دیر بعد ماسکو سے آنے والی ٹرین آگئی۔ امام صاحب نے ٹرین کے بڑے آفیسر سے رابطہ قائم کیا، میرا تعارف کروایا اور پھر فسٹ کلاس میں دو آدمیوں کا آرام دہ کیمین ہمارے حوالے کر دیا گیا۔ دن کے بارہ بجے ہم ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ آخر کار یہ دن بھی بیت گیا، رات بھی گزر گئی، گاڑی تازقستان میں ہی رواں تھی، جب صبح کے نونج چکے تو اب ہم ترکمانستان میں تھے۔

ترکمانستان میں:

گاڑی ترکمانستان کے جس شہر میں رکی ہم نے یہاں اتر کر مائتہ وغیرہ کیا، سور کا گوشت یہاں بھی فروخت ہو رہا تھا..... یہ وہی ترکمانستان ہے کہ جسے حضرت احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا..... ابھی ہم بحیرہ خوارزم کے قریب سے گزر کر دریائے جیحون (دریائے آمو) کے کنارے کنارے ٹھوس سفر تھے، یہ دریا افغانستان سے چلا آ رہا تھا بحیرہ خوارزم میں گر رہا تھا۔ بحیرہ خوارزم کے قریب ہی خوارزم کا علاقہ اور خیوہ کا شہر ہے، انہی علاقوں کی نسبت سے یہاں خوارزم شاهی سلطنت وجود میں آئی..... مگر جب سلطانوں نے جہاد چھوڑ کر عیش و عشرت کو اپنایا تو چنگیز اور اس کے پوتے ہلاکو نے علاؤ الدین خوارزم شاہ کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی پھر روسیوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا۔ ”نساء“ اسی ترکمانستان کا شہر ہے جو ایران کی سرحد پر واقع ہے، اس شہر کو امام احمد ابو عبد الرحمن نسائی کی پیدائش گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ وہ امام ہیں کہ جن کی لکھی ہوئی حدیث کی کتاب ”نسائی شریف“ صحاح ستہ میں شامل ہے۔ امام نسائی امام بخاری کے شاگرد ہیں..... امام نسائی کے شہر کے ساتھ ”مرو“ کا شہر ہے جو مسلمانوں کی عظمتوں کا نشان ہے..... مسلمانوں کی عظمتوں کے نشانات کیونست انقلاب نے برباد کر دیے تھے۔ افغانستان کی طرف سے آنے والا دریائے آمو میرے ساتھ ساتھ بہ رہا تھا، بحیرہ خوارزم میں گر رہا تھا، مجھے تو یہ بڑا خوش دکھائی دے رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں اب پامیر کی چوٹیوں سے بحیرہ خوارزم تک قدرے آزاد ہوں، دہریت کی نضا قدرے چھٹی ہے، ضیا پاشیوں کی ابھی ابتداء ہوئی ہے، تب تو نور اور پھیلے گا جب امام نسائی کی کتاب کا پھر سے چرچا ہوگا، قال اللہ و قال الرسول ﷺ کی صدائیں ترکمانستان میں پھر سے گونجیں گی۔ اس ملک کے دارالحکومت ”اشک آباد“ میں قرآن وحدیث سن کر اہل ترکمانستان کی اشکلیں جب آنکھوں سے جاری ہوں گی تو قرآن کے الفاظ میں یہ کیفیت پیدا ہوگی:

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُمَا فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُلْ حَتَّىٰ يُؤْتِيَاكُمُ الْاَمْرَ مِنْ رَبِّهِمْ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ عِنْدَهُمْ لَمُبْطِلِيْنَ

عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ بِقَوْلِهِمْ رَبَّنَا اٰمَنَّا فَا كُنْتُمْ مَعِ الشَّاهِدِيْنَ ﴿٨٣﴾

(انفالہ: ۸۳)

”وہ لوگ جب اس کلام کو سنیں گے جو رسول ﷺ کی طرف نازل کیا گیا تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی آنکھیں اشکوں سے ڈبڈبائی جاتی ہیں اس وجہ سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا، وہ بول اٹھتے ہیں..... ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، ہمیں کو ابھی دینے والوں میں لکھ لے۔“

اب ہماری گاڑی ترکمانستان سے نکل کر ازبکستان میں داخل ہو چکی تھی، ہم ترکمانوں کے وطن کو الوداع کہہ رہے تھے۔ وہ ترکان کہ جن کی کوکھ سے طغرل اور الپ ارسلان جیسے بادشاہوں نے جنم لیا۔ اس خاندان نے سلاہقہ کے نام سے صدیوں تک حکومت کی، الپ ارسلان نے رومی عیسائیوں کے خلاف جہاد کیا، مصر کے فاطمی شیعہ خلفاء کی حکومت کو ختم کیا اور عباسی خلیفہ کے ساتھ اپنے رشتے کو مستحکم کیا۔

امام بخاری کے شہر میں:

۲۴ اگست کا دن اور ایک بجنے کو تھا کہ ہماری گاڑی بخارا کے ریلوے سٹیشن پر کھڑی ہوئی۔ تازقستان میں قدرے سردی تھی، ترکمانستان میں اس سے کم اور بخارا میں قدرے گرمی کا احساس تھا..... سٹیشن سے ہم نے نیگیسی پکڑی اور بیس پچیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب ہم اپنے امام کے شہر میں تھے۔ میں نے نیگیسی والے سے کہا کہ ہمیں اس پرانے بخارا میں لے چل کہ جہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نیگیسی سے اتر کر شہر کی گلیوں میں گھومتے ہوئے اس مسجد میں پہنچے جسے مسجد کلاں کہا جاتا ہے۔

جامع مسجد امام بخاری میں:

دریائے زرفشان کے کنارے آباد بخارا بڑا قدیم شہر ہے، یہ تقریباً دو ہزار پانچ سو سال پرانا ہے۔ مجاہدین اسلام کے یہاں فاتحانہ داخل ہونے سے قبل یہ آتش پرستوں کا شہر تھا، پھر خاندان بنی امیہ کے ابتدائی دور میں عساکر اسلام کے سپہ سالار قتیبہ بن مسلم اس شہر میں فاتحانہ شان سے داخل ہوئے اور اس جگہ آئے کہ جو آج مسجد کلاں کے نام سے معروف ہے۔ تب یہ مجوسیوں کا آتش کدہ تھا، یہاں صدیوں سے آگ کا آلاؤ چل رہا تھا، اہل بخارا آگ کی پوجا میں لگن تھے مگر قتیبہ رضی اللہ عنہ نے آگ کے اس آلاؤ کو ٹھنڈا کیا اور پھر یہ جگہ کہ جہاں آگ کے سامنے سجدہ ریزی ہوتی تھی، آگ کے خالق کے سامنے سجدہ ریزی ہونے لگی۔ قتیبہ بن مسلم رضی اللہ عنہ نے جب سے یہاں اپنی جہیں اپنے مالک کے حضور جھکائی تھی تب سے یہ مسجد تھی اور مسجد بھی کلاں تھی یعنی بڑی مسجد۔ ہاں تو یہی وہ مسجد ہے کہ جس میں ننھے محمد کو اس کی ماں قرآن کی تعلیم کے لیے بھیجا کرتی تھی، ننھا محمد یتیم تھا، اس کا باپ اسماعیل فوت ہو چکا تھا، ماں سوت کات کات کر محمد کو پرہاتی رہی۔ محمد اب بڑا ہو چکا تھا، جس قدر انہوں نے بخارا میں تعلیم حاصل کرنا تھی وہ کر لی۔ اب وہ تعلیم کے لیے بغداد اور حجاز کو چل دیے۔ مدینہ میں انہوں نے اس جگہ بیٹھ کر ”الجامع الصحیح“ لکھی جو جگہ مسجد نبوی میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے ”ریاض الجنۃ“ یعنی جنت کے باغ کے نام سے موسوم ہے..... امام بخاری کی یہ کتاب جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مشتمل ہے ایسی معروف ہوئی کہ پوری امت نے اس پر اجماع کر لیا کہ قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب محمد بن اسماعیل بخاری کی لکھی ہوئی ”الجامع الصحیح“ ہے کہ جسے لوگ بخاری شریف کہتے ہیں..... امام بخاری جب حجاز سے واپس بخارا آئے تو اسی مسجد کلاں میں بخاری شریف کا درس دینے لگے، مدریس کا کام کرنے لگے۔

ہاں..... تو میں امام بخاری کی اسی مسجد میں کھڑا تھا، مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں واقعی

اپنے امام کی اس مسجد میں کھڑا ہوں جہاں قال اللہ وقال الرسول ﷺ کی صدائیں امام بخاری کی زبان سے اہل بخارا سنتے تھے، پھر وہ اس کے مطابق عمل پیرا ہوتے تھے۔

ہاں..... تو یہ مسجد رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع الیدین کا منظر پیش کرتی تھی، آئین کے ساتھ اس کے در و دیوار کو نج اٹھتے تھے..... بخارا میں نہ کوئی مزار تھا نہ قبہ تب بخارا تو حید و سنت کا مرکز تھا، اس لیے کہ امام بخاری اس شہر میں صحیح بخاری پڑھایا کرتے تھے۔

امام بخاری کی جلا وطنی کے بعد بخارا پر اب تک کیا ہوتی؟:

امام بخاری..... بخاری پڑھا رہے تھے کہ امیر بخارا نے پیغام بھیجا کہ امام صاحب میرے بچوں یعنی شہزادگان بخارا کو محل میں آ کر بخاری پڑھایا کریں۔ امام صاحب نے کہا کہ یہ حدیث رسول ﷺ کی توہین ہوگی کہ حدیث کا علم بادشاہ کے محل میں چل کر جائے، فرمایا کہ جسے طلب ہے وہ یہاں آجایا کرے۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ..... چلو علیحدہ پڑھا دیا کرو..... امام صاحب اس پر بھی نہ مانے کہ باقی طلباء کے ساتھ ہی شہزادے بھی پڑھیں گے۔ بس پھر کیا تھا بعض درباری مولویوں نے جو پہلے ہی امام صاحب کی شہرت اور عزت سے حسد کرتے تھے، والی بخارا کو بھڑکایا اور امام صاحب کو بخارا سے جلا وطن کر دیا گیا۔

میں مسجد کو دیکھے چلے جا رہا تھا، اب محراب کے سامنے کھڑا تھا، امام صاحب کی زندگی کے لمحات میرے دماغ کی نگاہیں دیکھے چلی جا رہی تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا امام یہاں سے نکل کھڑا ہوا اور پھر جب صحیح بخاری کو بھلا دیا گیا، خنفت نے اپنا راج جمایا، تصوف یہاں آدھمکا، خواجہ بہاؤ الدین نقشبند کے سلسلہ نقشبندی کا یہاں چلن ہوا، پھر ان کی خانقاہ بنی اور دربار شرک و بدعت کا آستانہ بنا..... اس پر اللہ کے غضب کا کوڑا برسسا اور اس نے برسنایا تھا کہ امام بخاری جیسے امام المحدثین کہ جنھوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی حدیثوں کو اس قدر دور دراز علاقوں سے عرق ریزی سے اکٹھا کیا کہ وہ مصروف ترین امام چالیس سال تک

سالن کے ساتھ روٹی نہ کھا سکے، ان کی لکھی ہوئی کتاب ہدایت کی جب اس کی اپنی ہی قوم نے بے قدری شروع کر دی، وہ اللہ کے فرامین کی بجائے ایک امتی کے قول کو دین بنا کر اور اس کی طرف منسوب ہو کر حنفی بن بیٹھے، روحانی تزکیے کے لیے نقشبندی بن بیٹھے، تب بخارا زیر و زبر ہوا، کبھی ترکمانوں کے ہاتھوں اور کبھی چنگیز کے ہاتھوں اور پھر تیمور کے ہاتھوں اور جب عیسائی مذہب کے حامل زاران روس بخارا پر حملہ آور ہوئے تو کیفیت تب بھی بقول مولانا ابوالکلام آزاد مصنف ”غبار خاطر“ یہ تھی کہ ادھر روسی فوجوں نے بخارا کا محاصرہ کر رکھا تھا اور ادھر امیر بخارا مدرسہ میر عرب کے طالب علموں، استادوں اور صوفیوں کو اکٹھا کر رہا تھا کہ وہ ختم خواجگان پر نہیں تاکہ روسیوں کو شکست ہو۔

مولانا لکھتے ہیں..... اب لامحالہ ایک ایسا مقابلہ کہ جس میں ایک طرف ختم خواجگان ہو اور دوسری طرف توپ و تفنگ تو اس کا نتیجہ وہی نکلتا تھا جسے نکلتا چاہیے تھا..... اور وہ نتیجہ پھر اس طرح نکلا کہ لوسی قابض ہو گئے اور اہل بخارا تہ تیغ کر دیے گئے، مسجد کلاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ اب بخارا مدصوں زاران روس کے صلیبی بچوں میں پی کر اہتلاحتی کہ کچھ تھوڑی سی داخلی خود مختاری دے کر زاران روس نے بخارا کی امارت ایک سابق حکمران خاندان کے حوالے کر دی۔ پھر اللہ نے مزید موقع دیا کہ ادھر جنگ عظیم اول میں روس تباہ حال ہوا اور ادھر امیر بخارا نے ۱۹۱۷ء کے اوائل میں بخارا کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا..... اب بجائے اس کے کہ امرائے بخارا داخلی خود مختاری سے فائدہ اٹھاتے یہاں لادینیت اور شرک کا استیصال کر کے کتاب و سنت کو رواج دیتے اور کامل آزادی ملنے پر کتاب و سنت کا قانون نافذ کرتے وہ اسی پرانی بے ڈھنگی چال اور ڈیڑھی ڈگر پر چلتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روسی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھے لکھے طبقے نے جو کہ اصل اسلام قرآن و حدیث سے بے خبر تھا وہ حنفیت اور قبر پرستی کو ہی دین سمجھ کر اسلام سے انکار کی باتیں کرنے لگا، پھر اس طبقے نے ”جدید یہی اش بخارا“ کے نام سے سیکولر پارٹی بنائی جو مذہب کا

مذاق اڑاتی تھی۔ امیر بخارا امیر عالم خان کی آنکھیں اس پر بھی نہ کھلیں کہ وہ سیکولرزم اور لادینیت کا مقابلہ اصل اسلام کے نفاذ سے کرنا حالانکہ اللہ نے اسے کامل آزادی کے ساڑھے تین سال دیے۔ بہر حال جب اس نے موقع ضائع کر دیا تو ان ملحدوں کو روسی کمیونسٹوں نے اپنے ساتھ ملایا اور ۲ ستمبر ۱۹۲۶ء کو بخارا ستر سال تک کے لیے کمیونزم کے پمجہ استبداد میں چلا گیا۔

مسجد کلاں جو امام بخاری کے زمانے میں کچی ہوا کرتی تھی اور اب پختہ اینٹوں کی عظیم الشان شاہی مسجد ہے، روسیوں نے اسے شراب خانے میں بدل دیا۔ میں اس مسجد کے حجروں میں، اس کے ہال میں اور ہال کے ساتھ ملحق کئی ستونوں پر مبنی دوسرے بڑے ہال میں گھوم رہا تھا۔ یہ ساری مسجد ویران تھی، شراب کی بھٹیوں سے اٹی ہوئی تھی۔ اس سے بڑھ کر رب کے عذاب کا کوڑا اور کس طرح سے بر سے گا کہ جہاں سے اللہ کے نبی ﷺ کی کتاب کو دیس نکالا دیا گیا وہاں شراب کی بھٹیاں بن گئیں۔ شراب پی کر روسی جانور یہاں کیا کرتے تھے اسے سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے، کمیونزم کا پرچار یہاں سے ہوتا تھا، سو مسجد میں کانٹے جاتے تھے۔

بہر حال ستر سال بعد اللہ نے ایک بار پھر اہل بخارا کو موقع دیا ہے، افغان جہاد کی ضرب سے امام بخاری کی مسجد کلاں پھر اپنے نمازیوں کے لیے کھل چکی ہے، اس کی مرمت جاری ہے۔ مگر کیا اب اس میں امام بخاری ﷺ کی کتاب کا درس دیا جائے گا یا کہ پھر اس پر اپنی ڈگر پر چلا جائے گا اور امام بخاری ﷺ کا بس نام ہی اس مسجد کے ساتھ لاحق رہ جائے گا؟ دائیں طرف عظیم مینار کلاں ہے جبکہ سامنے مدرسہ میر عرب ہے۔

مدرسہ میر عرب:

یہ مدرسہ آج سے ساڑھے چار سو سال قبل یمن کے ایک عربی شیخ عبد اللہ نے بنوایا تھا چنانچہ انہی کے حوالے سے اسے مدرسہ میر عرب کہا جاتا ہے۔ یہ مدرسہ روسی کمیونسٹوں نے اپنی

گمرانی میں تقریباً تیس سال قبل ہی کھول دیا تھا، یہ مدرسہ کیا تھا، یہاں کمیونزم کی تعلیم دی جاتی تھی اور یہاں داڑھی منڈے نائی اور پتلون پہننے والے کمیونسٹ مولوی تیار کیے جاتے تھے۔ میں نے مدرسے میں دیکھا کہ طالب علموں اور اساتذہ کی تصویریں جگہ جگہ گرہوں کی شکل میں آویزاں تھیں۔ اور جب میں اس مدرسے کے ناظم سے ملا اور اس سے پوچھا کہ اب تو یہ مدرسہ کمیونسٹوں کے تسلط سے آزاد ہو گیا ہے تو اس وقت یہاں کا نصاب تعلیم کیا ہے۔ کیا اس نصاب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب بھی موجود ہے؟ تو مجھے جواب نفی میں دیا گیا۔ جبکہ اس وقت جو نصاب ہے اس کے بارے ناظم صاحب نے مجھے بتلایا تو وہ وہی حنفی مذہب پر مشتمل تھا۔

اس مدرسے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف والے کمرے میں کئی پختہ قبریں ہیں، میں اس کمرے میں داخل ہوا تو یہاں اس مدرسے کے بانی عبداللہ یمنی کی قبر تھی، امیر بخارا اور اس کے خاندان کی قبریں بھی تھیں اور یہ ساری پختہ تھیں جبکہ میر عرب اور امیر بخارا کی قبریں کافی بلند تھیں۔

یہ قبریں مسلمانوں کے عام قبرستان میں کیوں نہ بنائی گئیں؟ آخر مدرسے میں انھیں بنانے کا کیا مقصد تھا؟ قبروں کے یہ خصوصی اہتمام ہی تو شرک کا باعث بنتے ہیں اور پختہ قبر سے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ویسے ہی منع کر دیا ہے۔ مسلم کی حدیث ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبر بنانے سے منع کیا ہے۔

مدرسے سے اب ہم باہر نکلے، بائیں جانب مینارکلاں اور اس کے ساتھ لائبریری دیکھتے ہوئے ہم محلے کی ایک پرانی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے چلے گئے۔ وہاں غسل کیا، وضو کیا اور ظہر و عصر کی نمازیں اکٹھی کیں، آرام کیا اور پھر بخارا شہر گھومتے ہوئے مغرب کے وقت سٹیشن پر پہنچے۔ ادھر سٹیشن پر وہی ڈاک والی گاڑی آچکی تھی، چنانچہ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے، اپنے امام کا شہر ہم نے دیکھ لیا تھا۔ وہ امام کہ جس کے نام سے اس شہر کا پوری دنیا میں نام

ہے، اس شہر کو بھی امام کے نام سے کہ یہ شہر ان کی پیدائش گاہ ہے اور ان کی لکھی ہوئی صحیح بخاری کہ جو قرآن کے بعد صحیح ترین حدیث کی کتاب ہے، اس پر فخر ہے۔ مگر یہ محض فخر کی حد تک ہی ہے جبکہ عملی طور پر یہ لوگ عامل بالحدیث ہونے کے بجائے حنفی مذہب کے حامل ہیں اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اب بخارا شہر میں یہودی بھی کافی تعداد میں ہیں۔ بہر حال اب ہماری منزل ”سمرقند“ شہر تھا۔

سمرقند میں امام بخاری کی قبر پر:

رات بھر گاڑی چلتی رہی اور ۲۵ اگست کی صبح کو پانچ بجے ہم سمرقند میں تھے، سٹیشن پر ٹیکسی والے کو کہا کہ ہمیں امام بخاری کی قبر پر جانا ہے۔ وہ کہنے لگا خواجہ اسماعیل؟ ہم نے کہا ہاں خواجہ اسماعیل۔ یہاں سمرقند میں لوگ امام بخاری کو خواجہ اسماعیل کہتے ہیں حتیٰ کہ ”مشرک“ وہ بستی جہاں امام صاحب کی قبر ہے، اس بستی کو بھی خواجہ اسماعیل ہی کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں ۲۵ کلومیٹر دور تقریباً پونے گھنٹے بعد ہم بستی خواجہ اسماعیل میں تھے۔ اب ہم اس بستی کے قریب ایک وسیع و عریض پر نضا مقام پر تھے۔ یہیں امام بخاری کی قبر ہے، جب ہم مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو یہاں موجود لوگوں نے ہمیں دیکھتے ہی آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے مصافحے اور معاف کیے۔ میرے ہم سفر ترجمان ساتھی فتح اللہ نے میرا تعارف کروایا تو یہ لوگ اور بھی خوش ہوئے۔ اب ہمارا رخ امام بخاری کی قبر کی طرف تھا۔ چلتے ہوئے دائیں جانب مسجد تھی جبکہ سامنے امام بخاری کی قبر تھی، جب قبر پر پہنچے تو امام صاحب کے لیے بے ساختہ دونوں ہاتھ رب کے حضور اٹھ گئے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور نواز شریف:

یہاں کے نائب امام نے قبر سے ملحق کمر ا دکھلایا، اس نے مسجد کی دیوار کے ساتھ قبر کے پہلو میں ایک حجرے کی طرف اشارہ کیا اور بتلایا کہ یہاں لوگ عبادت کرتے ہیں، چلے

کشتیاں کرتے ہیں۔ میں خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتا رہا اور سنتا رہا۔ اب ہم کھلے صحن میں آگئے تھے، یہاں ایک بڑے چوکور پتنگ پر گدے اور تکیے سجا دیے گئے تھے، ہمیں یہاں بٹھا دیا گیا تھا۔ اب گفتگو شروع ہوگئی، میں نے کہا ہمارے وزیر اعظم نواز شریف صاحب بھی پچھلے دنوں یہاں آئے تھے اور انہوں نے امام صاحب کے مزار کے لیے چالیس ہزار ڈالر کا اعلان کیا تھا تو کیا تعمیراتی کام شروع ہو چکا ہے؟ نائب امام نے کہا ہاں کام شروع کر دیا گیا ہے..... میں نے کہا لاہور سے ہمارا ایک ماہنامہ ”مجلۃ الدعوة“ نکلتا ہے، ہم نے جب وہاں نواز شریف کا یہ بیان اخبار میں پڑھا تو اس پر ادارہ لکھا اور نواز شریف سے کہا کہ..... کاش! آپ امام بخاری کے مزار پر جانے سے قبل بخاری پڑھ لیتے؟ میرے اس جملے پر امام صاحب سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے اور پھر بولے آپ کا اس سے کیا مطلب ہے؟ میں سمجھا نہیں۔ میں نے کہا آپ نے بخاری پڑھی ہے؟ فرمانے لگے پڑھی تو نہیں۔ میں نے کہا تو پھر

سنیے! امام بخاری اپنی صحیح میں ایک حدیث لائے ہیں:

”مومنوں کی ماں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حبشہ میں عیسائیوں کا گرجا دیکھا جس میں تصاویر بھی آویزاں تھیں تو اس کا اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ان میں جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تو یہ لوگ اس کی قبر کے پاس عبادت گاہ تعمیر کر دیتے اور پھر اس (عبادت گاہ) میں اس شخص کی تصویر لٹکا دیتے اور! یہ لوگ اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہیں۔“

میں نے کہا یہ حدیث امام بخاری لائے ہیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ امام صاحب تو قبروں پر عبادت گاہوں اور چلہ کشیوں کے لیے حجروں کے صریحاً مخالف ہیں۔ کچی قبر سے بھی اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرما رکھا ہے..... تو اگر نواز شریف بخاری شریف پڑھتا تو بھلا کیا ہزاروں ڈالر کا اعلان کر کے جاتا کہ جس اعلان کے امام بخاری صریحاً مخالف ہیں اور اگر آپ بخاری شریف پر عمل کرتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ امام صاحب نے میری اس گفتگو پر

کہا کہ جناب پہلے تو امام صاحب کی قبر کچی ہی ہوا کرتی تھی، یہ پختہ تو بعد میں بنی ہے، باقی جو آپ فرماتے ہیں سچ تو یہی ہے اور اب میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں؟

امیر تیمور کے مقبرے پر:

امیر تیمور جو کہ چنگیز خان کی نسل سے تھا، وہ اسلام قبول کرنے والے قبیلے ”برلاس“ سے تعلق رکھتا تھا، ۱۳۳۵ء کو سمرقند کے مضافات میں واقع ”کوش“ شہر میں پیدا ہوا، بعد میں تیمور نے اس کا نام ”سبز“ رکھا، سمرقند کو پایہ تخت بنایا، فتوحات میں وہ چنگیز سے بھی بازی لے گیا، دہلی کو اس نے تاراج کیا، افغانستان اس کے زیر نگیں تھا، سارا وسط ایشیا روس، ایران، ترکی، عراق اور شام وغیرہ کو اس نے تلوار کے زور پر زیر کیا۔

آٹھویں صدی ہجری کا یہ وہی دور ہے کہ جس میں صوفیت اور مزار پرستی مسلمانوں میں جڑ پکڑ رہی تھی، یہ تاراجی بھی اسی دور میں مسلمان ہوئے، تلوار کے تو وہ دھنی تھے ہی اب انہوں نے اسلام قبول کیا تو اسلام انہیں تصوف و مزارات والا ملا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امور جہانبانی میں تیموری بادشاہوں نے تو رہ چنگیزی سے راہ نمائی لی اور اپنے اصول وضع کیے مگر نہ اگر تیمور جیسے بادشاہ کو جو کہ ایک چوتھائی دنیا کا فاتح تھا، صحیح اور اصل اسلام مل جاتا تو اس جہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ مگر افسوس کہ صوفیت کے اس دور میں تیمور نے بھی اپنا پیر پکڑا اور اسی سے راہ نمائی لیتا تھا، فتوحات میں اس نے اتنی قتل و غارت کی کہ تاریخ میں یہ اس کے نام پر ایک سیاہ داغ ہے۔ مگر اس کے باوجود امیر تیمور اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتا ہے کہ میں نے جو بھی فتوحات کیں شریعت محمدی ﷺ کے لیے کیں، ظلم منانے اور انصاف کے قیام کے لیے کیں۔ اپنے وقت کا یہ انتہائی باجبروت بادشاہ جو کہ اپنے آپ کو بادشاہ کی بجائے امیر کہلاتا تھا، اتفاق سے اس کا نام بھی تیمور تھا جس کے معنی لوہے کے ہیں، وہ واقعی اسمِ بامسمیٰ تھا۔ میں اس کے مقبرے پر ہی کھڑا تھا، اس کے اندر داخل ہوا، گنبد کے نیچے یہاں کوئی دس بارہ قبریں تھیں، بڑی قبر امیر کے پیر کی تھی، اس سے نیچے چھوٹی قبر امیر تیمور کی

تھی، اس کے دو بیٹوں اور الفخ بیک کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ الفخ بیک بادشاہ تو تھا مگر اسے زیادہ دلچسپی سائنس کے شعبہ فلکیات سے تھی اور اس مقصد کے لیے اس نے رصد گاہ بھی بنائی تھی۔ وہ اتنا بڑا سائنسدان تھا کہ اس نے ٹیلی سکوپ کی ایجاد سے چار صدیاں قبل اپنے دور میں جو فلکیاتی جدول بنائی سائنس اس پر اب تک کوئی اضافہ نہیں کر سکی۔

امیر تیمور کے مقبرے پر (علی ہجویری کا) دربار یاد آ گیا:

جب ہم یہ مقبرہ دیکھ چکے تو محافظ نے بتلایا کہ اصل مقبرہ تو نیچے ہے۔ چنانچہ ہم یہاں سے نکل کر ایک دوسرے کمرے میں داخل ہو کر سیڑھیوں کے ذریعے نیچے چلے گئے تو پتا چلا کہ یہ ہیں اصل قبریں جبکہ ان کی سیدھ میں اسی گنبد میں ان اصلی قبروں کے اوپر قبریں بنا دی گئی ہیں جو کہ جعلی ہیں۔ ایسا کرنے میں کیا حکمت کا فرما تھی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتے ہیں البتہ مجھے لاہور میں جناب علی ہجویری صاحب کا دربار یاد آ گیا کہ جسے لوگ داتا دربار کہتے ہیں، اس بھائی گیٹ والے دربار میں بھی واقع قبر کہ جسے لوگ داتا کی قبر سمجھ کر اس سے لپٹتے اور سجدہ ریز ہوتے ہیں، یہ بھی جعلی ہے جبکہ اصل قبر اس کے نیچے ہے جہاں بہت کم اور خاص لوگوں کی رسائی ہوتی ہے اور یہ جو نیچے اصلی قبر ہے تو درحقیقت اصلی یہ بھی نہیں ہے بلکہ اصلی قبر تو لاہور کے شاہی قلعے میں شیش محل کے پہلو میں زمین کے نیچے واقع ایک گنبد میں ہے..... میں داتا صاحب کی اصلی قبر دیکھ چکا ہوں اور ”داتا دربار کی تلاش میں“ کے نام سے اس پر مضمون بھی لکھ چکا ہوں جو مجلۃ الدعوة میں چھپنے کے بعد اب میری کتاب ”شاہراہ بہشت“ کی زینت بنا ہے۔

لوگوں کی عقیدت کا بھی عجیب حال ہے، جب وہ اندھی عقیدت کی رو میں بہ نکلتے ہیں تو وہاں عقل کی دخل اندازی ممنوع قرار پاتی ہے..... نہیں تو بھلا..... کیا داتا کی بھی قبر ہوتی ہے؟ داتا کی بات چلی ہے تو عرض کرتا جاؤں کہ داتا کا معنی ہے دینے والا اور لوگ دیکھیں پکا کر اور اپنے گھر سے دودھ کے مٹکے بھر کر وہاں لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ داتا دیتا ہے، داتا تو تب کہیں کہ جب مزار سے مختلف چشمے جاری ہوں، یہ دودھ کا ہے، یہ بیٹوں کا ہے کہ وہاں

سے بچے نکل رہے ہیں، یہ روپوں کا سوراخ ہے کہ وہاں سے ہزار کے نوٹ برآمد ہو رہے ہیں..... تو یہ کیا ہوا کہ ہر وہ چیز جسے اللہ پیدا کرتا ہے اسے ایک شخص کے نام منسوب کر کے اور اپنی طرف سے دانا کا لقب دے کر کہنا شروع کر دیا کہ یہ دانا دیتا ہے۔ سوچنے اور عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ بھلا کہیں دانا کی بھی قبر ہوتی ہے؟

میرے پیارے قارئین کرام! یہ کیا ہوا کہ سمرقند سے خیالات کی دنیا میں لاہور پہنچ گیا حالانکہ میں ابھی سمرقند میں ہوں، تیمور کے مقبرے پر ہوں، خیال کی دنیا مجھے لاہور میں اس لیے لے آئی کہ مزار تیمور اور مزار علی ہجویری میں ایک مماثلت تھی..... بہر حال تیمور کے مقبرے سے نکلا اور ایک اور مزار کے قریب سے گزر رہا جس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہ مزار حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، ان کے بیٹے حضرت قاسم کا ہے، یہاں سے چلے تو تیمور کی بنائی ہوئی ایک بہت بڑی تاریخی مسجد بھی دیکھی، اس مسجد کو امیر تیمور نے اپنی بیگم کے نام پر بنایا تھا، اس لیے اس کا نام ”مسجد بی بی خانم“ ہے۔ یہ مسجد اور اس سے ملحق دوسری اہم عمارتیں جن کا رقبہ کئی ایکڑ زمین پر مشتمل ہے، کمیونسٹ دور میں یہ کارخانے اور شراب خانوں میں بدل دی گئی تھیں۔ اب جب میں وہاں پہنچا تو ان کے دروازے کھل چکے تھے، کاریگر کام کر رہے تھے، ستر سال تک شراب و کباب کی آلودگیوں کے بعد اب یہ مسجد پھر سے آباد ہونے کو ہے، افغان جہاد کی برکت سے یہاں جینین پھر سے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے والی ہیں۔

یہاں سے نکلے، سمرقند کی مارکیٹ میں پہنچے، سمرقندی روٹی خریدی، بس میں بیٹھے اور تاشقند کی طرف عازم سفر ہوئے۔

تاشقند میں:

آج ۲۵ اگست کو روس کے طویل دورے کے بعد دوبارہ تاشقند میں پہنچا ہوں جبکہ ۱۳ اگست کو اپنے ساتھی حافظ عبدالعزیز کے ہمراہ میں اسلام آباد سے تاشقند ایئر پورٹ پر

اترا تو ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی ایک ٹیکسی ڈرائیور کو روپی زبان میں ایک پتا دکھایا اور ۷۰ روپے ملے کر کے چل دیے۔ یہ پتا شیخ تاجی بانی کا تھا۔ پروفیسر حافظ محمد سعید کے چھوٹے بھائی حافظ حامد صاحب دو عرب ساتھیوں کے ساتھ چند دن قبل یہاں سے ہو کر گئے تھے اور یہ پتا ہم نے انھیں سے لیا تھا۔ انھوں نے بتلایا تھا کہ یہ بزرگ کتاب و سنت کے عالم اور توحید کے داعی ہیں، چنانچہ ہم ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر کار ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ ان کے دو شاگرد ہمیں ایک مسجد میں لے گئے، ہم وہاں پہنچے تو نماز مغرب کا وقت ہو چکا تھا، ۳۵، ۴۰ نوجوان مسجد میں جمع ہو گئے، معاف اور مصالحت شروع ہو گئے، محبت کا ایک سماں تھا اور یہ سماں اسلام کی برکت سے تھا، ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے سے شناسا ہیں۔ اذان کے بعد اب تکبیر ہوئی اور مجھے آگے کر دیا گیا، صف بندی شروع ہو گئی، کندھے کے ساتھ کندھا اور پاؤں کے ساتھ پاؤں ملنا شروع ہو گیا اور پھر ”ولا الضالین“ کے بعد مسجد آمین کی آواز سے کونج اٹھی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو نوجوان ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے، سنت اللہ نے کہا شیخ تاجی کچھ دیر بعد آ جائیں گے، آپ کا کھانا ہمارے گھر ہے، لہذا آئیں اور چلیں۔ اب چار پانچ نوجوان اور ہم بھائی سنت اللہ کے گھر چل دیے، پھل اور میوہ جات کے بعد کھانا دسترخوان کی زینت بنا دیا گیا۔ ادھر شیخ گھر میں آئے تو انھیں پاکستانی مہمانوں کے آنے کی اطلاع ہو گئی، شیخ بڑی اچھی عربی بولتے تھے لہذا یہی زبان ہمارے درمیان اظہار بیان کا ذریعہ تھی۔ شیخ سے ان کی دعوتی سرگرمیوں کی تفصیل سنی اور مرکز الدعوة کی دعوتی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ اب عشاء کا وقت ہو چکا تھا، شیخ نے اب پھر مجھے مصلے پر کھڑا کر دیا، نماز کے بعد دعوت خطاب دی، میں نے عربی میں دس پندرہ منٹ تقریر کی، شیخ نے ترجمہ کیا اور پھر یہاں سے فارغ ہو کر مسجد کے قریب شیخ ہمیں اپنے بیٹے کے گھر لے گئے، وہاں دوبارہ کھانا تیار تھا، خیر چند تلمیذ لیے اور پھر شیخ نے کہا تا شقتہ شہر سے چند کلومیٹر دور ہمارا گاؤں ہے میں تو رات وہاں رہتا ہوں، باقی آپ کی مرضی رات یہاں ٹھہریں یا میرے پاس

گاؤں میں چلیں۔ ہم نے کہا کہ شیخ صاحب ہم تو گاؤں چلیں گے۔ شیخ نے جیپ نکالی اور ہم گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ۲۰، ۱۵ منٹ کے بعد شیخ کا گاؤں آ گیا اور پھر رات شیخ کے گھر گزاری، صبح ہو گئی تو شیخ کی جیپ پر تاشقند شہر دیکھنے کو نکلے۔

تاشقند کا مدرسہ قوقلد اش:

روس کا سب سے بڑا شہر اس کا دارالحکومت ”ماسکو“ ہے، دوسرا بڑا شہر ”لینن گراڈ“ تیسرا یوکرین کا ”کیف“ اور چوتھا بڑا شہر تاشقند ہے۔ آزادی کے بعد اب یہ ترکستان یعنی پانچ مسلم ریاستوں میں سب سے بڑا شہر ہے۔ ”میٹرو“ یعنی زیر زمین ریل بھی انہی چار شہروں میں چلتی ہے۔ تاشقند کا پرانا اور تاریخی نام ”شاش“ ہے، یہ صاف ستھرا، کھلا، شاداب اور ازبکستان کا دارالحکومت ہے۔ ہم اس شہر کے سب سے بڑے مدرسے ”قوقلد اش“ میں گئے، اس مدرسے کو ۱۶ ویں صدی عیسوی میں خواجہ احرار نے بنوایا تھا، اس مدرسے کے مدیر حاجی محمد قاسم ہیں۔ شیخ نے ان سے ہمارا تعارف کروایا تو بڑے خوش ہوئے۔ مدیر مدرسہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ اچانک تعلیم کو چھوڑا اور خفیہ طور پر دینی تعلیم کے حصول میں لگ گئے اور پھر بچوں کو چھپ کر دینی تعلیم دینے لگے، روسیوں کو پتا چلا تو انھیں اس جرم کی سزا میں جیل بھیج دیا، دو سال جیل میں رہے، یہ شیخ کے شاگرد بھی ہیں۔ اب افغانستان میں روس کی شکست کے بعد دو سال قبل یہ مدرسہ آزاد ہوا، افغان جہاد کی ضرب نے اس کا تالا توڑا تو حاجی صاحب اس مدرسے کے مدیر ٹھہرے، اب وہ ہماری ضیافت کرنے کے بعد ہمیں مدرسہ دکھلا رہے تھے، مدرسے کو کارخانے میں بدل دیا گیا تھا، ستر سال تک اس میں تخریب کاری ہوتی رہی، اب اس کی تعمیر جاری تھی اور تعلیم بھی۔ بچیوں سے لے کر نوجوان لڑکیوں تک یہاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں، تاشقند کے عریاں معاشرے میں ان لڑکیوں کے سروں پر سفید رومال دیکھ کر دل بڑا خوش ہوا کہ دین کی طرف اور پردے کے اسلامی تصور کی طرف سفر بہر حال شروع ہو چکا ہے۔

مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کی زیارت اور علم کے موتیوں کا گھر:

شیخ اب ہمیں پرانے شہر کی سیر کروا رہے تھے، یہ پرانا شہر بھی ہمارے پرانے لاہور کی طرح تنگ نہ تھا بلکہ کھلا تھا، جیپ پر ہم اس شہر میں گھوم رہے تھے، گھومتے ہوئے ایک مسجد کے سامنے آ کر رک گئے، اس مسجد کا نام ”طلاشخ“ ہے یعنی سونے کا شیخ۔ ممکن ہے یہ شیخ سونے کا کاروبار کرتے ہوں، بہر حال یہ مسجد جو چار سو سال پرانی ہے، انھوں نے ہی بنوائی ہے، یہ بڑی خوبصورت اور وسیع مسجد ہے، مسجد کو دیکھنے کے بعد ہم کتب خانے کی طرف گئے جو اسی مسجد کے صحن میں ہے۔ ہم دروازے پر پہنچے تو دن کا پچھلا پہر تھا، ایک نوجوان دروازے کو تالا لگا رہا تھا، ہم نے السلام علیکم کہا، تعارف کروایا اور پھر اس نوجوان نے ہمارے لیے دروازہ کھول دیا، اب ہم علم کے موتیوں کے گھر میں تھے۔

یہ نوجوان لڑکا جس کا نام نور محمد ہے، اس مکتب کا نائب مدیر ہے، عربی زبان جانتا ہے، اس نے ایک بڑے کمرے کا دروازہ کھولا اور بتلایا کہ اس کتب خانے کا نام ”کتب خانہ مسلمانان ماوراء النہر“ ہے۔ ہم نے اس ہال میں قرآن وحدیث اور دیگر کتب کے قیمتی اور تاریخی قلمی نسخے دیکھے اور جب اتفاق سے میری نظر چھت پر پڑی تو معلوم ہوا جیسے چھت بھی کتابوں کی ڈالی گئی ہے جبکہ یہ چھت کتابوں کی تو نہیں تھی بلکہ لکڑی کو رنگ ہی اس انداز سے کیا گیا تھا کہ وہ لائینوں میں لگی ہوئی کتابیں معلوم ہوتی تھیں۔

اب ایک دوسرے ہال کمرے کا دروازہ کھولا گیا، اس میں ہر موضوع پر بے شمار کتابیں تھیں، الماریوں کی الماریاں بھر ہوئی تھیں۔ میں نے نور محمد سے پوچھا کہ یہ کتابیں کمیونسٹوں کے دور میں کیسے باقی رہ گئیں؟ تو اس نے کہا کہ جب انقلاب آیا تو لوگوں نے یہ کتابیں گھروں میں چھپالیں اور نہ جانے کس کس کے پاس کہاں کہاں کتاب چھپی رہی، اب دو سال قبل جب ہمیں آزادی ملی ہے تو لوگوں نے وہ کتابیں یہاں جمع کرنا شروع کر دیں اور یوں دوبارہ ایک عظیم لائبریری بن گئی ہے۔ جبکہ ابھی توقع ہے کہ یہ مزید بڑی ہوگی۔

(ان شاء اللہ) اور دنیے پر آمد ہوں گے، آباء نے علم کے جو موتی جمع کیے تھے وہ بکھرنے کے بعد پھر یہاں اکٹھا ہوں گے۔

اس ہال سے نکلنے کے بعد دوبارہ پہلے ہال میں آئے تو درمیان میں چبوترے پر ایک بڑی کتاب دکھائی دی، نور محمد نے کہا یہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ ہے۔ ہم آگے بڑھے مگر یہ تو نوٹو کا پی تھی، میں نے جھٹ کہا بھائی نور محمد یہ تو نوٹو کا پی دکھار ہے ہو، اصل کہاں ہے؟ اب اس نے ایک دروازہ کھولا، ہم اس میں داخل ہوئے تو پھر ایک اور دروازہ تھا، اسے کھولا، اب ہم ایک کمرے میں شیشے کی الماری کے سامنے کھڑے تھے، مصحف عثمان رضی اللہ عنہ اب میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہرن کی کھال پر یہ لکھا گیا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب صحابی اور دوہرے داماد اور خلیفہ ثالث عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو جب مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا تو وہ یہی قرآن تلاوت فرما رہے تھے ان کے خون کے چھینٹے جس جگہ پڑے وہ یہ آیت تھی:

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ (البقرة: ۱۳۷)

”اور ان کے مقابلے میں تمہیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔“
اس جگہ نشانی رکھی ہوئی تھی جبکہ ہمارے سامنے کا جو مقام کھلا تھا وہ سورہ زمر تھی۔ اس الماری کے اوپر سورہ الحجر کی یہ آیت لکھی ہوئی تھی:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴿٦﴾ (الحجر: ۶)

”بے شک ہم اس قرآن کو اتارنے والے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۳ سالوں میں قرآن نازل ہو کر مکمل ہوا، یہ قرآن صحابہ رضی اللہ عنہم کے سینوں میں محفوظ تھا اور لکھا ہوا بھی تھا، اس لیے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے لکھوا لیا کرتے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن کا ایک نسخہ تیار کروایا، ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو یہ نسخہ ان کی وساطت سے ام المومنین حضرت

حصہ پنچا کے پاس تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں اسی مصحف سے چھ مصحف تیار کروائے اور وہ ملک کے مختلف علاقوں میں بھیجے تاکہ ان کے مطابق نقلیں تیار ہو کر مسلمانوں میں پھیلیں۔ چنانچہ ان چھ میں سے وہ قرآن جو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زیرِ تلاوت تھا وہ اب تاشقند میں محفوظ ہے اور دنیا بھر میں چودہ سو سال سے اللہ کی اس کتاب میں زیرِ وزیر کی تبدیلی بھی واقع نہیں ہوئی اور ہوتی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

شیخ تاجی اور ان کی تفسیر:

شیخ کے گھر میں ایک روز صبح ناشتے پر اکٹھے ہوئے تو میں نے شیخ تاجی سے پوچھا کہ آپ نے تعلیم کیسے اور کس سے حاصل کی؟ یہاں تو نہ ایسی تعلیم کی اجازت تھی نہ کوئی اتنا بڑا عالم دین باقی رہ گیا تھا اور نہ ہی کتابوں کا وجود تھا۔ تو انہوں نے کہا ۵۰ سال قبل جبکہ جبر و تشدد کا کمیونسٹ دور اپنے عروج پر تھا تو ایک شامی عالم دین یہاں آئے، ان کے اصل نام سے تو کوئی واقف نہ تھا البتہ داملمہ شامی (مولانا شامی) کے نام سے وہ معروف تھے، صابر داملمہ نے ان سے چھپ چھپا کر تعلیم حاصل کی اور یہ صابر داملمہ میرے استاد ہیں، ان سے میں نے تعلیم حاصل کی۔ جبکہ کتابیں نایاب تھیں تو شیخ کہنے لگے ہمیں جس کے بارے میں معلوم ہوتا کہ اس کے پاس فلاں کتاب ہے تو وہ کتاب ادھار لے کر اسے ہاتھ سے لکھتے اور علم حاصل کرتے پھر یہ علم بھی بند اور خفیہ کمروں میں حاصل کرتے تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے، اب اللہ کا شکر ہے کہ محنت و مشقت اور خوف کی وہ حالت جاتی رہی۔ اس پر میں نے کہا کہ شیخ صاحب اس خوف کو ختم کیا ہے تو افغانستان کے جہاد نے کیا ہے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شیخ صاحب قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اٹھالائے جو کہ ازبکی زبان میں چھ جلدوں میں ہے اور اسے پچھلے تیرہ سالوں میں شیخ نے مکمل کیا ہے۔

قارئین کرام! ذرا غور کیجیے! روس میں اسلام کس قدر سخت جان ثابت ہوا کہ اس کے ایک نام لیوانے علم حاصل کیا، پھر تیرہ سال کے عرصہ میں تفسیر لکھی، پھر اپنے ساتھیوں سے

چندہ اکٹھا کر کے خفیہ طور پر دوسو کی تعداد میں اس تفسیر کو چھپوا بھی ڈالا پھر اس نور کو آگے پھیلا دیا۔ آج اس شیخ کے کئی شاگرد ہیں، اس کا گھر مقامی بچوں کو قرآن کی تعلیم دینے کا آج بھی سرچشمہ ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شیخ نے کس قدر دلیری اور جرأت کا مظاہرہ کیا مگر نہ اگر کمیونسٹ باخبر ہو جاتے تو شیخ کی سزا کو لی اور پھانسی سے کم نہ ہوتی۔

قازقستان میں دعوتی سرگرمیاں:

قازقستان جو کہ تاشقند کے قریب ہی ہے وہاں دعوت اور سیر و سیاحت کا پروگرام بنایا گیا، رات شیخ کے گاؤں میں ہی بسر ہوئی تو شیخ کے تین چار پرانے شاگرد بھی آگئے، وہ بھی ہمراہ ہو لیے اور ہم عازم قازقستان ہوئے۔ آدھ گھنٹہ بعد ہم قازقستان میں تھے اور پھر ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم ایک شہر ”لیلیس“ میں پہنچے، یہاں تھوڑی دیر رکنے کے بعد ہم ایک قصبے ”تربت“ میں جا پہنچے۔ ہم اس قصبے کے قبرستان میں گئے، دیکھا بڑا پختہ قبرستان تھا اور بعض قبروں پر اہل قبور کی تصاویر بنائی گئیں تھیں۔ اسی طرح یہاں دو تین مزار بھی تھے جو مختلف ولیوں کے تھے۔ ایک مزار میں گھپ اندھیرا تھا، اس میں اس شخص کو داخل کرتے ہیں جسے جنات لاحق ہو گئے ہوں۔ غرض یہ سب دیکھنے کے بعد ہم قریب ہی ایک مسجد میں چلے گئے، یہ مسجد کافی بڑی اور پرانی تھی، مسجد میں قالین بچھے ہوئے تھے اور ایک جگہ لمبی لائن میں تیار کی ہوئی پگڑیاں پڑی تھیں۔ اب ظہر کا وقت ہو چکا تھا، امام صاحب آگے بڑھے اور ہم نے نماز ظہر ادا کی۔ نماز کے بعد امام صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے سب نمازیوں کو ہمارے بارے میں بتلایا اور پھر مجھے دعوت سخن دی۔ تب میں نے اس قصبے کے نمازیوں سے جو کہ ۳۵، ۴۰ کے قریب تھے، گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو یہ آزادی اللہ تعالیٰ نے انغان جہاد کی برکت سے دی ہے اور یہ آزادی آپ سے اس وقت چھینی گئی تھی جب آپ سے دین چھوٹ گیا تھا، لہذا اب آپ آزادی کی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دین کی طرف لوٹیں، قرآن کا ترجمے سے مطالعہ کریں اور احادیث کا مطالعہ کریں، امام بخاری، امام ترمذی اور امام

نسائی آپ کے علاقے ترکستان میں حدیث کا علم پھیلاتے رہے اور یہی علم اصل دین ہے جو کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زبان سے نکلا ہے اور پھر آخر پر انھیں آگاہ کیا کہ کس طرح امام بخاری اور دیگر محدثین نے اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث کو بیان کیا ہے کہ جن میں آپ ﷺ نے پختہ قبریں بنانے اور ان پر عمارتیں بنانے سے منع کیا ہے۔ میری تقریر کا ترجمہ شیخ صاحب کر رہے تھے۔

دعوت کے اس پروگرام کے بعد ایک ہوٹل میں کھانا کھایا اور گھوڑی کا دودھ پیا، یہ بہت کھٹا تھا، میں نے تو دو تین گھنٹے ہی لیے جبکہ میرے ساتھیوں نے خوب پیا۔ تازقستان میں گھوڑے بہت ہوتے ہیں حتیٰ کہ لوگ بھیڑیں بھی گھوڑوں پر بیٹھ کر چراتے ہیں، گھوڑوں کا گوشت کھاتے ہیں اور دودھ پیتے ہیں اور یہ دودھ گائے کے دودھ سے مہنگا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تازقستان میں پٹرول سات روپل کالیٹر ہے جبکہ ازبکستان میں ۱۰ روپل کالیٹر ہے۔ اسی طرح بھیڑ کا گوشت بھی تازقستان میں ۵۵ روپل فی کلو جبکہ ازبکستان میں ۱۳۰ روپل فی کلو ہے۔ جبکہ روپل کا حال اب یہ ہے کہ وہ ایک ڈالر کا پانچ صد مل جاتا ہے۔

شادی اور تبلیغ:

میرے ہم سفر ساتھی بھائی فتح اللہ کے سسرال بھی تازقستان میں ہیں، ان کی دعوت پر ان کے سسرال بھی جانا ہوا اور پھر ان کے عزیزوں کے گاؤں میں بھی۔ وہاں ہم نے گھروں میں جا کر انفرادی دعوت دی، لوگ ظہر کے وقت مسجد میں اکٹھے ہو گئے، نماز پڑھانے کے بعد میں نے تقریر شروع کر دی۔ امام بخاری کے حوالے سے مسجد میں گفتگو کی تو تقریر کے بعد ایک بوڑھا تازقستانی اٹھا اور کہنے لگا ہمیں بخاری لا کر دو ہم اسے پڑھیں، امام بخاری ہمارے علاقے کا عالم ہے مگر کسی نے ہمیں بتلایا ہی نہیں کہ وہ تو اتنا بڑا عالم تھا۔ اسی طرح ایک چالیس سالہ نوجوان جو کہ تقریر سنتا رہا مگر اس نے نماز نہیں پڑھی، جب میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا ابھی میری عمر کم ہے۔ تب میں نے اسے سمجھایا کہ موت کا کیا پتا کب

آجائے اور یہ کہ چالیس سال عمر کوئی تھوڑی عمر نہیں ہے۔

مسجد کے قریب ہی شادی تھی، لہذا ہمیں دعوت ولبہ دی گئی، ہم جب اس دعوت میں پہنچے تو لوگ ایک پاکستانی مسلمان کو اپنے درمیان پا کر بڑے خوش تھے۔ اب میں نے تقریر شروع کر دی، تقریر کے بعد کھانا کھایا، کھانے کے بعد دولہا کے والد نے سب شرکاء کو پانچ پانچ روپل دیے، جب مجھے دینے لگے تو میں نے سو (۱۰۰) روپل کا نوٹ جیب سے نکالا اور انہیں دینے لگا اور کہا کہ ہمارے ہاں تو شرکائے دعوت پیسے دیتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگے ہمارے ہاں شرکائے دعوت کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور پیسے بھی دیے جاتے ہیں تو آپ چونکہ تازقستان میں ہیں اس لیے یہاں تو تازقستانی رواج ہی چلے گا اور پھر پانچ روپل میری جیب میں ڈال دیے گئے۔

جب کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو نوجوانوں نے ہمیں گھیر لیا، وہ اصرار کرنے لگے کہ آپ رات یہیں گزاریں اور رات کو ہمیں دعوت دیں۔ میں ہاں کرنے والا تھا کہ بھائی فتح اللہ نے مجھے بتلایا آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ ریکا ڈنگ کے ڈیک سیٹ کر رہے ہیں، اسٹیج بن رہا ہے تو رات کو سب لڑکے اور لڑکیاں شراب کی محفل سجائیں گے۔ ڈانس کریں گے تو یہاں ہماری دعوت کون سنے گا؟ انہوں نے کہا یہاں ہر شادی میں ایسا ہوتا ہے چنانچہ میں نے شرکت سے معذرت کر لی۔

اسی روز ہم واپس تاشقند آگئے، میں نے فتح اللہ سے پوچھا کہ آپ کے ہاں جہیز کی رسم بھی ہے؟ تو اس نے بتلایا ہاں موجود ہے مگر اس طرح کہ تازق لوگوں میں لڑکے والے لڑکی کے گھر پیسے بھیجتے ہیں، انہی پیسوں سے دلہن کا جہیز تیار ہوتا ہے، جبکہ اوزبک لوگوں میں آدھا خرچہ لڑکے والے کا اور آدھا خرچہ لڑکی والوں کا ہوتا ہے اور اسے ملا کر دولہا دلہن کے لیے ضروریات زندگی کا سامان تیار کیا جاتا ہے۔

شادی پر جلسہ:

ہمارے دیہات میں دیندار لوگوں کی شادیاں ہوتی تھیں تو وہ اس موقع پر مسجد میں جلسے کا انعقاد کر دیتے جبکہ بے دین لوگ مجرے کا اہتمام کرتے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال آج کل ازبکستان میں ہے یہاں دو تین شادیوں میں شامل ہونے کا موقع ملا، دعوت طعام کے ساتھ دعوت خطاب بھی دی گئی۔ ایسی ہی ایک شادی تاشقند کے ایک موحد نوجوان کی تھی، ساڑھے پانچ سو کے قریب مہمان تھے، میوہ جات، پھل اور تہوہ سامنے رکھ دیا گیا اور پھر تقریریں شروع ہو گئیں، جلسے کے اختتام پر کھانا کھلایا گیا۔ مجھے یہاں ساتھیوں نے بتلایا کہ تین سال قبل یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ازبکستان میں شادی جیسے فنکشن پر کہ جس کا انعقاد شراب اور مخلوط ڈانس کے بغیر ناممکن تھا اس پر یوں جلسے ہونا شروع ہو جائیں گے۔

تاشقند کی ایک مسجد میں اہل تو حید نوجوانوں کے درمیان:

وسط ایشیائی ریاستیں جب آزاد ہوئیں تو سعودی عرب کے ایک نوجوان عالم دین نے تاشقند میں ڈیرے جمالیے، مساجد میں انہوں نے دروس قرآن کا سلسلہ شروع کیا، نوجوان ان سے بڑے مانوس اور متاثر تھے، وہ واپس سعودی عرب گئے تو اب حکومت انہیں واپسی کی اجازت دینے میں نال منول سے کام لے رہی تھی۔ ایسی ہی ایک مسجد کہ جس میں شیخ درس دیتے تھے میں اس مسجد میں دعوتی درس دینے کے لیے پہنچ گیا، نماز مغرب کے بعد محلے کے پڑھے لکھے بہت سے نوجوان اکٹھے ہو گئے، اس درس میں میرا مترجم ترند کا ایک نوجوان تھا۔ جو کہ عربی بڑی اچھی جانتا تھا، اب میں نے اپنا درس بھی امام ابو عیسیٰ ترمذی کی حدیث سے شروع کیا۔

میرے بھائیو! دن میں آخری نماز عشاء کی نماز ہے، اس کے بعد انسان سونے کی تیاری کرتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کو ایسے موقع کے لیے ایک دعا سکھلائی اور فرمایا کہ اسے بستر پر لیٹتے وقت پڑھا کرو، پھر اگر تم رات کو نوت ہو گئے تو تمہاری

موت اسلام پر ہوگی اور اگر رات گزار کر صبح اٹھ کھڑے ہوئے تو صبح خیر سے ہوگی۔ اب یہ دعا ملاحظہ فرمائیں:

« اَللّٰهُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِيْ اِلَيْكَ وَ وَّجْهْتُ وَجْهِيْ اِلَيْكَ وَ فَوَّضْتُ اَمْرِيْ اِلَيْكَ رَغْبَةً وَ رَهْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَا وَ لَا مَنجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اَمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَ نَبِيِّكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ »

”اے اللہ! میں نے اپنی جان تیرے حوالے کر دی اور اپنا رخ تیری طرف پھیر دیا اور اپنے کام کو تیرے سپرد کر دیا اپنی رغبت اور تیرے خوف سے، تیرے عذاب سے پناہ اور نجات کی جگہ کہیں نہیں، مگر تیرے پاس..... میں تیری اتاری ہوئی کتاب پر اور تیرے بھیجے ہوئے رسول پر ایمان لایا۔“

ترمذی میں ”رغبة اليك“ کے بعد ”والجاء ظهري اليك“ (یعنی میں نے اپنی پشت کو تیری پناہ میں دے دیا) کے الفاظ بھی آتے ہیں اور اس روایت میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے ”و بنبيك الذي ارسلت“ کی جگہ ”وبرسولك الذي ارسلت“ پڑھا تو حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر مارا اور فرمایا ”و بنبيك الذي ارسلت“ یعنی آپ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ آپ کی بتلائی ہوئی دعا میں ”نبی“ کی جگہ ”رسول“ کا لفظ آئے۔ غور فرمائیے! کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے محض ایک لفظ کی تبدیلی کو کہ جس کے مطلب و مفہوم میں کوئی فرق نہیں، اسے برداشت نہیں کیا تو اب جو لوگ قرآن و حدیث کے مسلک کی بجائے انسانوں کے نام پر مسلک بنائے پھرتے ہیں، اماموں کے اقوال کو نبی کی حدیث پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو حنفی ہیں۔ بتلائیے! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انھیں سینے سے لگائیں گے یا کہ ان کے سینوں پر ہاتھ مار کر انھیں دھکے دیں گے؟ آپ کے ازبکستان کے شہر ترمذ کے رہنے والے امام ترمذی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث لائے ہیں وہ تو یہی کہتی ہے کہ پھر ایسے لوگوں کو دھکے ہی

پڑیں گے۔

میرے بھائیو! میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کہ علم دو طرح کے ہیں، ایک وہ علم کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہ ہو اور دوسرا وہ علم کہ جس میں صحیح اور غلط دونوں کا شبہ موجود ہو تو ان میں افضل اور اصل علم کون سا ہے؟ یقیناً وہی علم کہ جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو، اس علم کی ہر بات صحیح ہے، وہ قرآن کا علم ہے اور حدیث کا علم ہے، اب جو علم حدیث کا امام ہو یعنی اس علم کا کہ جو اللہ کے رسول ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہے اور آپ ﷺ کی زبان سے دین کا علم اس وقت تک نہیں نکلتا جب تک کہ اللہ نکلواتا نہیں:

وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ ﴿٥٠﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿٥١﴾ (النجم: ٣-٥)

”اور وہ تو اپنی مرضی سے بولتے ہی نہیں سوائے اس وحی کے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔“

تو..... اب بتلائیے! جس کے پاس یہ علم ہو امام اعظم اسے کہنا چاہیے یا کہ اسے کہ جس کا حدیث پر ایک کتابچہ تک بھی نہ ہو؟ تو میرے بھائیو! یہاں کے لوگ کس قدر بد قسمت ہیں، امام اعظم ان کا اپنا ہے، وہ امام کہ جس نے وہ کتاب لکھی کہ جو قرآن کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے، مگر یہ لوگ بخارا سے اسے جلا وطن کرتے ہیں، سمرقند کے قریب سوئے ہوئے اس امام کو بھلا دیتے ہیں اور لوگ ازبکستان سے ہزاروں میل دور جانچنے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو حنفی ہیں، امام ابو عیسیٰ ترمذی کو بھولے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو نقشبندی اور کرخی ہیں۔

مجھے بتلاؤ! پھر اس قوم کو دھکے نہ پڑیں تو اور کیا ہو۔

یاد رکھو! جو حدیث کا علم جانتا ہے وہی سب سے بڑا فقیہ ہے۔ امام یحییٰ بن شرف اپنی حدیث کی کتاب ”الاربعین النوویہ“ میں اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث لکھتے ہیں، آپ ﷺ فرماتے ہیں:

”میری امت میں سے اپنے دین کے معاملات میں سے جس نے چالیس حدیثیں حفظ کر لیں اللہ اس کو قیامت کے روز فقہاء اور علماء کے گروہ سے اٹھائے گا۔“ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ”فقہ اور عالم بنا کر اٹھائے گا۔“

اب غور فرمائیے! کہ اللہ کے رسول ﷺ کی نظر میں جو چالیس حدیثوں کا حافظ ہو وہ فقہ ہے اور جو لاکھوں حدیثوں کا حافظ ہو بھلا وہ کتنا بڑا فقہ ہوگا۔ امام بخاری کم بیش تین لاکھ احادیث کے حافظ تھے، امام ترمذی ایک لاکھ سے اوپر احادیث کے حافظ تھے۔ پھر امام بخاری نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں ابواب کی جو ترتیب مرتب کی ہے کہ سب سے پہلے قرآن کی آیت لاتے ہیں پھر باب کی مناسبت سے احادیث لاتے ہیں، ایک حدیث کو متعدد ابواب میں لاکر ثابت کرتے ہیں کہ اس سے فلاں فلاں مسائل ثابت ہیں، اب بتلائیے! امام کا یہ انداز فقہیانہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یقین جاپیے محدث سے بڑا فقہ کوئی نہیں ہوتا..... لہذا..... دین چاہتے ہو، حق چاہتے ہو تو قرآن و حدیث کو اپنا مسلک بنا لو۔

میں جب درس دے چکا تو سکولوں، کالجوں کے طلباء اور دوسرے نوجوان میرے گرد اکٹھے ہو گئے، کہنے لگے ہمیں پاکستان لے چلو، ہم پاکستان میں تعلیم حاصل کریں گے۔ ایک نوجوان میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا وہ وقت بھی کیا خوب ہوگا جب میں پاکستان میں قرآن و حدیث کا علم سیکھنے جاؤں گا۔

ایک دیہاتی عورت ”دیما تن“ کا قصہ:

مجھے معلوم ہوا کہ امارات کے ایک عربی شیخ تاشقند میں دعوت و تبلیغ میں کچھ عرصہ سے مصروف کار ہیں، میں شیخ کا پتا معلوم کر کے ان کے گھر پہنچا، شیخ سے ملاقات اور بات چیت ہوئی اور پھر میں جب تک تاشقند میں رہا شیخ سے ملاقاتیں بھی جاری رہیں اور شیخ کے ساتھ دعوتی پروگراموں میں شمولیت بھی۔ تاشقند کی ایک مسجد میں شیخ نے درس دیتے ہوئے ایک بڑا دلچسپ واقعہ سنایا۔

اندلس (ہسپانیہ) کا ایک وزیر کہیں سفر کر رہا تھا کہ ایک گاؤں کے قریب نہر پر سے گزر رہا تھا جہاں عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں، وزیر کے ہم سفر ساتھیوں میں ایک شاعر بھی تھا، اس نے عربی شعر کا ایک مصرع پڑھا اور وہ پہلا مصرع سنتے ہی دیہاتی عورت نے بے ساختہ اس کے ساتھ دوسرا مصرع ملا ڈالا، وزیر یہ سن کر اس دیہاتی عورت کی ذہانت پر متعجب و متحیر ہوا، اتفاق سے دیہاتن کہ جس کا نام دیہاتن تھا، حسن و جمال بھی اس پر فریفتہ تھا۔ چنانچہ وزیر نے اس عورت سے شادی کر لی۔ اب گاؤں کی رہنے والی دیہاتن شہر کی باسن بن گئی، کچی کتیا میں رہنے والی دیہاتن محل کی مالکن بن گئی۔ مگر شہر کی رنگینیاں اور محل کی دل فریادیاں اس دیہاتن کے دل سے گاؤں کی زندگی کی یادیں مٹانہ سکیں، وہ چھپروں پہ جانا، وہاں سے مٹی لانا، اس مٹی کو ہاتھوں اور پاؤں سے بنانا سنوارنا اور پھر اپنی کتیا کی لپیٹا پوچی کرنا، نہر اور نالے پر جا کر بھولیوں کے ہمراہ کپڑے دھونا، وہ صبح صبح سادہ سا کھانا تیار کرنا، اسے اپنے سر پہ سجانا اور گاؤں سے دور اپنے بھائی کے لیے لے کر جانا کہ جو فجر ہوتے ہی زمین میں ہل چلانے چل دیتا تھا۔ غرض گاؤں کی زندگی کے یہ مناظر دیہاتن کو یاد آتے تو وہ محل میں اداس ہو جاتی، سنگ مرمر کا فرش، شیشوں کا جڑاؤ، ہیروں کے چکاچوند بچے ہوئے پلنگوں کے آراستہ و پیراستہ نرم و گداز بستر کو یا کبھی کبھار تو اسے کھانے کو آتے۔ چنانچہ ایک روز اس نے محل کے صحن میں مٹی کو اکٹھا کیا، اس میں پانی ڈالا، کیچڑ بنایا اور پھر اس میں داخل ہو کر اپنی عادت پوری کرنے لگی۔ اب اس کا شوہر بھی محل میں آدھمکا، بیوی کو کیچڑ میں لت پت دیکھ کر بھونچکا رہ گیا، بیوی سے پوچھنے لگا یہ کیا؟ اس نے کہا گاؤں کی زندگی کو ترس گئی ہوں، اسی لیے آج اپنی عادت پوری کرنے کو دل چاہا ہے۔ اس پر وزیر نے بیوی کو کیچڑ سے نکالا اور کہا میں تیری عادت پوری کرنا ہوں..... اور پھر محل کے ایک خوبصورت کمرے میں زعفران، کستوری اور دیگر خوشبودار چیزوں کو ملا کر گارا بنایا اور اسے محل کے ایک خوبصورت ہال میں پھیلا دیا اور کہا کہ اب یہاں عادت پوری کر لو۔

دن گزرتے گئے، ایک روز میاں بیوی میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تو بیوی شوہر سے کہنے لگی جب سے اس دکھوں بھرے گھر میں آئی ہوں سکھ کا سانس نہیں لیا۔ اس پر وزیر نے اسے احسانات گنوانے شروع کر دیے اور آخر پر کہا:

”اس دکھوں بھرے گھر میں وہ دن بھی یاد کر کہ جب میں نے زعفران اور کستوری کا

گارا بنا کر محل میں پھیلا دیا۔“

اس پر دیہاتن کو شرمندگی کا احساس ہوا۔

امارات کے عرب عالم دین یہ واقعہ بیان کر کے فرمانے لگے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عورتوں کی اسی فطرت کی بنا پر کہ وہ شوہروں کی احسان فراموشی کرتے ہوئے معمولی بات پر بھی ساری زندگی کے احسانات کو پل بھر میں بھلا کر ناشکری پر آ جاتی ہے، ان کے بارے میں فرمایا:

”مجھے جہنم دکھائی گئی تو اس میں اکثریت عورتوں کی تھی (سبب یہ ہے کہ) وہ کفر کرتی ہیں۔ پوچھا گیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ فرمایا وہ خاندانوں کے احسانات کی ناشکری کرتی ہیں اگر تو ان میں سے کسی پر زندگی بھر احسان کرتا رہ پھر کبھی وہ تیری جانب سے کوئی معمولی سی بات دیکھے تو کہہ اٹھے گی:

« مَا رَأَيْتُ مِنْكَ حَيْرًا قَطُّ » (بخاری)

”میں نے تو تجھ سے کبھی کوئی خیر دیکھی ہی نہیں۔“

حقیقت اور بے عملی:

شیخ نے دوسرا اہم نکتہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں میں عمل مفقود ہے، بے عملی کی انتہا ہو چکی ہے اور آپ حیران ہوں گے کہ اس بے عملی کا سب سے بڑا سبب حنفی مذہب ہے، اس مذہب کے مطابق ایمان گھٹتا اور بڑھتا نہیں، سب کا ایمان ایک

جیسا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان اور ہمارے ایمان میں کوئی فرق نہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب قرآن کی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو:

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لَهُمْ بِيَوْمِهِمْ الَّذِي كَانُوا يَعْبَهُونَ ﴿١٦٢﴾

(التوبة: ١٦٢)

”تو یہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔“

اسی طرح امام بخاری نے بخاری شریف میں ”ایمان کا بڑھنا اور گھٹنا“ کے نام سے باب باندھ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے بھی ثابت کیا ہے کہ ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے مگر حنفی مذہب کے نزدیک کوئی شخص نیک ہو یا فاسق دونوں کے ایمانی وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب جب حنفیت کا یہ اصول ٹھہرا تو نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اکثر لوگ حنفی المسلمک ہو گئے کیونکہ اس مذہب میں آسانی تھی کہ عمل کرو نہ کرو سب کا ایمان یکساں ہے اور یہ کہ ایمان نہ نیکی کرنے سے بڑھتا ہے اور نہ گناہ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ چنانچہ آج مسلمانوں کی اکثریت بے عمل ہے جبکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنی آیات اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت کیا کہ نیکی کرنے سے ایمان بڑھتا اور گناہ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ شیخ صاحب کا خطاب اور انداز بیان بڑا موثر تھا، نوجوان بڑے ذوق شوق سے سن رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھوں کی نسبت نوجوان نسل کو جوں جوں معلوم ہو رہا ہے وہ دین کے اصل ماخذوں قرآن و حدیث کی طرف پلٹ رہے ہیں، بخاری اور مسلم کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس سے اپنا دین معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک روز میں نے بھائی فتح اللہ سے پوچھ لیا کہ بخاری کا ازبکی زبان میں ترجمہ موجود ہے کہ نہیں؟

اس پر مجھے فتح اللہ نے بتلایا کہ موجود ہے اور اس کی ایک جلد میرے پاس بھی پڑی ہے۔ اب میں نے وہ جلد منگوائی تو اس میں اصل متن نہ تھا، عربی زبان میں فرائین

رسول ﷺ نہ تھے بلکہ محض روسی رسم الخط کے ساتھ ازبکی زبان میں ترجمہ تھا اور اس ترجمے کے بارے میں فتح اللہ نے بتلایا کہ اس میں بھی اس طرح سے گڑبڑ کی گئی ہے کہ جس جگہ حنفی مسئلوں پر حدیث کی زد اور ضرب پڑتی ہے تو ان مسائل کے بارے میں بریکٹ (توسین) لگا کر لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ شافعیوں کے ہاں اس طرح ہے جبکہ احناف کے ہاں اس طرح ہے۔ تو یوں حدیث رسول ﷺ کو شافعییت کی طرف منسوب کر کے مقابلے میں حنفیت کو ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ ذرا غور کیجیے! کس قدر فریب، ما انسانی اور ظلم ہے جو امام بخاری کے دیس میں بخاری شریف کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ بہر حال صورتحال یہ ہے کہ یہ کتاب بھی جو کچھ عرصہ قبل سرکاری مفتیوں کی طرف سے شائع ہوئی تھی اب نہیں ملتی یعنی بازار سے لوگوں نے جوق در جوق خریدی ہے۔ اب لوگوں نے تو بخاری شریف خریدی ہے مگر انہیں کیا پتا کہ گڑ کے ساتھ زہر ملا کر دیا جا رہا ہے اور یہ ظلم حنفی مولویوں نے اس لیے کیا ہے کہ اگر ہم حدیث کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں حنفی مذہب لکھیں گے تو لوگ مسترد کر دیں گے، چنانچہ انہوں نے حدیث رسول ﷺ کے مسئلے کو شافعییت کا لبادہ اوڑھایا اور پھر اس کے مقابلے میں اپنا حنفی مسئلہ کھڑا کر دیا اور لوگوں کو بتلایا کہ جب تم حنفی ہو تو حنفی مسئلے پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

یہودیوں کے عبادت خانے میں:

ایک روز ٹکٹ کے سلسلے میں مجھے تاشقند ایر پورٹ پر جانا ہوا، وہاں بڑا رش تھا، ایک مسافر سے پوچھا کہ فلائٹ کہا جارہی ہے تو بتلایا گیا کہ اسرائیل۔ اسرائیل کے نام سے حیرانی ہوئی مگر پھر یہ حیرانی دور ہو گئی جب پتا چلا کہ یہاں تو ہر ہفتے پرواز جاتی ہے اور ازبکستان کے یہودی دھڑا دھڑا اسرائیل جا رہے ہیں۔

اب میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہودیوں کے عبادت خانے میں جایا جائے تاکہ ان کا عبادت خانہ دیکھا جائے۔ چنانچہ ہم تاشقند میں ان کے عبادت خانے میں چلے گئے، معبد

کے مربی سے ہم نے اپنا مدعا بیان کیا اور پھر وہ ہمیں اپنا عبادت خانہ دکھلانے لگا۔ بہت پرستی یہاں عروج پر تھی، ان کے بزرگوں اور ولیوں کی تصاویر موجود تھیں، تورات کا نسخہ بھی موجود تھا۔ میں نے مربی سے اس کی تحریف و تبدیلی اور شرک و اولیاء پرستی پر بات کی، عزیر علیہ السلام کے بارے کہا کہ آپ انھیں اللہ کا بیٹا مانتے ہیں جبکہ یہ عقلی اور نقلی طور پر فضول بات ہے۔ مربی کہنے لگا یہ کیسے؟ میں نے کہا جب اللہ کا بیٹا ایک انسان ہو گیا تو بیٹے میں بھی باپ والی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اب اس طرح تو سارے انسان رب ہو گئے، پھر تم مجھے بتلاؤ! یہاں عبادت کس کی کرتے ہو؟ اس پر مربی کو کوئی جواب نہ آیا تو بس اتنا کہہ سکا کہ ہماری تورات میں ایسا ہی لکھا ہے۔ میں نے کہا وہ تم نے بدل لیا، خود تمہارے ہاں اس کے کتنے ایڈیشن ہیں اور ہر ایڈیشن دوسرے سے مختلف ہے، تو اس کا کیا اعتبار کیا جائے؟ اس پر کہنے لگا آپ ہفتے کے دن آنا، ہماری عبادت بھی دیکھنا اور گفتگو بھی ہوگی۔ میں نے کہا کوشش کروں گا مگر شاید نہ آسکوں، بہر حال آپ سے یہ ضرور کہتا ہوں کہ ہماری کتاب قرآن کا مطالعہ کرنا، شاید عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی طرح آپ کی بھی قسمت میں اسلام جیسا دین حق ہو جائے۔

تاشقند سے جب ہم واپس شہر سے دور فتح اللہ کے گاؤں جانے لگے تو کوئی ٹیکسی نہیں مل رہی تھی، اتفاق کی بات ہے کہ ایک اویٹز عمر عورت نے ہمارے قریب آ کر بریک لگائی۔ اب ہم گاڑی میں بیٹھ گئے، میں نے اس عورت سے اس کا مذہب پوچھا تو کہنے لگی میں یہودن ہوں۔ میں نے کہا تم اپنی کتاب تو پڑھتی ہوگی؟ کہنے لگی ہاں! میں نے کہا آپ کا تو یہی خیال ہوگا کہ یہودیت ہی سچا مذہب ہے؟ کہنے لگی کیوں نہیں؟ اس پر میں نے کہا دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کریں تو شاید حق کہیں اور سے نکل آئے اور ساتھ ہی میں نے سوال کر دیا کہ انجیل پڑھی ہے؟ کہنے لگی ہاں پڑھی ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ پھر تو مسلمانوں کا قرآن رہ گیا اس کا بھی مطالعہ کر لو؟ کہنے لگی مطالعہ کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کہا وہ کیوں؟ کہنے لگی ہم میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے؟ میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگی آپ بھی جھٹکے والا کوشت نہیں

کھاتے، ذبیحہ کرتے ہیں جبکہ ہم بھی ذبیحہ کھاتے ہیں۔ اسی طرح تم بھی ختنہ کرتے ہو ہم بھی ختنہ کرتے ہیں۔ میں نے اسے کہا چلو! یہ باتیں تو مشترک ہو گئیں جبکہ توحید اور رسالت میں ہمارے تمہارے درمیان اختلاف ہے، وہ اختلاف بنیادی ہے، اس اختلاف میں حق کس کے پاس ہے اس کا پتا تبھی چلے گا جب آپ تورات اور انجیل کے بعد ہمارے قرآن کا مطالعہ کریں گی اور پھر اس پر میں نے بہت زیادہ زور لگا دیا، اوھر ہمارا گاؤں بھی آچکا تھا اور وہ بھی بالآخر اس بات پر آہی گئی تھی کہ اچھا اب قرآن بھی پڑھوں گی اور پھر میں نے اسے (۸۰) روبل کے بجائے (۱۰۰) سو روبل ہی ادا کر دیے۔

میرا کام دعوت اور اس کے لیے تالیف قلب تھا سو اللہ کی توفیق سے مختصر وقت میں جو ممکن تھا وہ میں نے کر دیا جبکہ ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔

وادی فرغانہ:

وسط ایشیا کی پانچ ریاستوں میں سب زیادہ دینی بیداری ازبکستان میں ہے۔ چنانچہ آج ۲۸ اگست کو ہمارا پروگرام وادی فرغانہ کی جانب تھا، رات ساڑھے نو بجے ہم ریل میں بیٹھے، ہم تین ساتھی تھے جبکہ بھائی فتح اللہ کے بیوی بچے بھی اس کے ہمراہ تھے۔ چنانچہ ہم نے پورا کیبن بک کرانے کا فیصلہ کیا مگر دو کیبنوں میں دو دو برتھ ملے۔ ایک کیبن میں ہم بیٹھے، اس میں ایک روسی تھا اور دوسرا اس کا ساتھی۔ ہم نے روسی سے کہا کہ آپ دونوں ساتھ والے کیبن میں چلے جائیں۔ وہ نہ مانے تو بھائی فتح اللہ اور میں نے اسے سمجھایا مگر وہ نہ مانا بلکہ اٹا دھمکیاں دینے لگا اور فتح اللہ کے چھوٹے بچے کو اٹھا کر وہاں لیٹنے لگا۔ اب فتح اللہ بھی عقیدہ توحید کا حامل اوزبکی نوجوان تھا، اس نے اسے کمرے سے نکال باہر کیا اور کہا کہ تم روسی ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتے آئے ہو، اب ہم تمہیں مزہ چکھائیں گے، ہمارے علاقے میں ہمیں پر رعب جہاتے ہو، میں تیری تکہ بوٹی کر دوں گا۔ اس پر روسی گھبرا گیا اور دوسرے کیبن میں چلا گیا۔ روسی باشندے شہروں میں کافی تعداد میں ہیں اور اچھی پوسٹوں پر بھی۔ تاشقند

میں بہت زیادہ روی ہیں مگر اب یہ لوگ گھبرارہے ہیں، گھبراتے اس لیے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے حقوق چھینے ہیں، ان کی جائیدادوں پر قبضہ کیا ہے، اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کیے ہیں اور اب جبکہ یہاں کے مقامی مسلمان قدرے آزاد ہوئے ہیں، اسلامی بیداری ان میں پیدا ہونا شروع ہوئی ہے تو روسی گھبرارہے ہیں اور کئی ایک تو واپس ماسکو کی راہ لے رہے ہیں۔

گاڑی چل رہی تھی، آدھی رات ہو چکی تھی، فتح اللہ نے مجھے جگایا اور کہا ”فرغانہ“ آگیا ہے۔ یہاں گاڑی کافی دیر رکی۔ ہاں تو یہ وہی شہر ہے جہاں ظہیر الدین بابر پیدا ہوا تھا، تیموری نسل کا یہ اوزبک نوجوان جس کی اولاد ہندوستان میں شاہان مغلیہ کہلوائی، اس نے دریائے آمو پار کیا اور افغانستان سے ہوتا ہوا ہندوستان آیا۔ یہاں اس نے پانی پت کے میدان میں ہندوؤں کو عبرت ناک شکست دی۔ ایودھیا کو جب فتح کیا تو فتح کی یاد میں یہاں ۱۵۲۸ء میں مسجد تعمیر کروائی، ہندوؤں نے مسلمانوں کی اس جہادی یادگار بابر کی مسجد کو چھ دسمبر ۱۹۹۲ء کے روز منہدم کر کے وہاں مندر بنا دیا ہے۔ آہ! کہ جہاں مرکز توحید تھا وہاں اب شرک کا گڑھ بن گیا، جہاں الہ واحد کی عبادت ہوتی تھی وہاں اب مورتیوں کی پوجا ہونے لگی، جہاں قرآن وحدیث کی آوازیں گونجتی تھیں وہاں اب بھجن گائے جانے لگے..... ایسا کیوں؟ سیدھی اور صاف بات یہی ہے کہ جب مسلمانوں نے جہاد چھوڑا تو ان کی جہادی یادگار کو ڈھا کر مندر بنا دیا گیا۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفُتِمَتْ صَوَابِعُ وَيَسِيعُ وَصَلَوَاتٌ
وَمَسَاجِدٌ يُدْعَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا وَيُنْصَرِفُ اللَّهُ مَنِ
يُنْصِرُهُ وَيُؤْتِي اللَّهُ الْقَوِيَّ عَزِيزًا ﴿٤٠﴾ (الحج: ٤٠)

”اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا (مشرکوں کا غلبہ نہ روکتا) تو

خانقاہیں اور گرے، یہودیوں کے عبادت خانے اور مسجدیں کہ جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے، یہ سب گرا دی جاتیں۔ (اور یاد رکھو!) جو کوئی اللہ کی مدد کرے گا (جہاد کرے گا) تو اللہ اس کی مدد کرے گا (اسے غلبہ دے گا) بلاشبہ اللہ زور آور، غلبے والا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہر زمانے میں مشرکوں کو روکا اور انبیاء اور مومنوں کو قتال کرنے کی اجازت اور حکم دے کر ان کا دفاع کیا، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یہ مشرک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہودیوں کے عبادت خانے کو، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گرجوں اور خانقاہوں کو اور اب خاتم الانبیاء ﷺ کے زمانے میں مسجدوں کو مسمار کر ڈالتے۔

چنانچہ آج جہاد چھوڑا اور باہری مسجد ڈھادی گئی، جہاد چھوڑا اور ”فرغانہ“ روسیوں کے زرعے میں ستر سال تک کراہتا رہا اور پھر افغانستان میں جہاد ہوا اور محض اس کی گرمی سے ہی فرغانہ روسیوں کے زرعے سے نکل آیا اور آج امیر حمزہ ”فرغانہ“ کو دیکھ رہا ہے تو یہ جہاد کی برکت سے دیکھ رہا ہے۔ باہر کی جنم بھومی سے اب گاڑی چل چکی تھی، رات کا آخری نصف حصہ بھی مسافت میں طے ہو چکا تھا، صبح کے سات بج رہے تھے، اب ہم وادی فرغانہ کے سب سے بڑے شہر ”اندجان“ میں تھے۔

دین کی جان.....شہر اندجان:

آج سے دو سال قبل جب روس ٹوٹ رہا تھا، گورباچوف جا رہا تھا، یلسن آ رہا تھا تو ان دنوں نوائے وقت کی جانب سے عطاء الرحمن، غالباً پاکستان کے پہلے صحافی تھے جو روس گئے اور وہاں سے خبریں جمع کر کے بھیجتے رہے اور وہ نوائے وقت کی زینت بنتی رہیں۔ عطاء الرحمن صاحب جب واپس آئے تو محترم عبدالجبار شاہ کراچی ایئر کیٹر پبلک لائبریری پنجاہ کی وساطت سے میں جناب عطاء الرحمن سے ملا تو انھوں نے مجھے کہا کہ روس جائیں تو ازبکستان میں واقع

واویٰ فرغانہ میں جانا نہ بھولیں اور نمزگان اور اندجان میں تو ضرور جائیں۔ میں نے کہا کیوں؟ وہاں کیا خاص بات ہے جو ضرور جاؤں؟ تو کہنے لگے آپ کو وہاں کتاب وسنت کے حاملین راسخ العقیدہ لوگ ملیں گے، ان سے مل کر آپ کو یقیناً خوشی ہوگی۔

اب میں اندجان شہر کے وسط میں مرکزی مسجد اور مدرسے میں تھا، مسجد اور مدرسہ اڑھائی تین ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے، مسجد اور مدرسے کی عظیم تاریخی عمارت کہ جسے کمیونسٹوں نے کارخانے میں بدل دیا تھا، یہاں لوہے کا کام ہوتا تھا مگر اب یہاں لوہے اور ہتھوڑے کی آوازوں کی بجائے اس مسجد کے مینار سے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں جبکہ طلباء کی کلاسوں میں قال اللہ وقال الرسول ﷺ کی ایمان افروز تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسہ ابھی حال ہی میں کھلا ہے، روس کے مختلف علاقوں سے یہاں ڈیڑھ صد کے قریب طلباء موجود ہیں۔ مدرسے کے رئیس شیخ عبدالولی ہیں جبکہ نائب رئیس اور جامع مسجد کے امام و خطیب شیخ عبد الغفور صاحب ہیں۔ میں نے شیخ عبد الغفور سے ان کے کمرے میں ملاقات کی، عبد الغفور صاحب چالیس سال کی عمر کے نوجوان عالم دین ہیں، عربی زبان بڑی روانی سے بولتے ہیں، ان کی گفتگو میں مٹھاس، دین کا خلوص اور للہیت کی خوشبو آ رہی تھی۔ شیخ صاحب جب خطبہ جمعہ دیتے ہیں تو اندجان کی مرکزی مسجد میں سات ہزار کے قریب نمازی خطبہ سنتے ہیں۔ سورہ فاتحہ کے بعد جب امام ”ولا الضالین“ کہتے ہیں تو مسجد کے درو دیوار ”آمین“ سے کونج اٹھتے ہیں۔ یہاں ظہر اور عصر کی نمازوں کے اوقات میں ڈیڑھ سے اڑھائی ہزار کے قریب نمازی ہوتے ہیں، پھر ان دونوں نمازوں کے بعد قرآن وحدیث پر مشتمل مختصر درس دیے جاتے ہیں۔ یہ درس سننے کے لیے لوگ اردگرد کے دیہات سے یہاں ظہر کی نماز پڑھنے آتے ہیں۔

اس علاقے میں کتاب وسنت کی خوشبو کیسے پھیلی، جب میں نے اس کے بارے پوچھا تو پتا چلا کہ ترکستان کا وہ علاقہ جو اس وقت چین کے قبضے میں ہے، اس کی سرحدیں تاجکستان

اور تازقستان سے ملتی ہیں اور درہ خنجر اب پر اس کی سرحد پاکستان کے علاقے گلگت سے ملتی ہے، شاہراہ ریشم چینی ترکستان اور پاکستان کو ملاتی ہے تو اس علاقے کو چین کے کمیونسٹوں نے ”سکیانگ“ کا نام دے رکھا ہے۔ اس کا دار الحکومت ”کاشغر“ کا وہ تاریخی شہر ہے جسے حضرت قتیبہ بن مسلم بذلتہ نے فتح کیا تھا، اس شہر ”کاشغر“ کا ایک عالم قاسم خواجہ چینی کمیونسٹوں کے ظلم سے تنگ آ کر ازبکستان آ گیا اور وہ یہاں قرآن و حدیث کی تعلیم چھپ چھپ کر لوگوں کو دیتا رہا۔ شیخ عبدالوہابی جو اندجان کے مدرسہ کے مہتمم ہیں، وہ اسی شیخ کے شاگرد ہیں۔ شیخ کے ایک اور شاگرد رحمت اللہ بن قادر تھے، یہ شیخ عبدالوہابی کے ہم جماعت تھے، عبدالغفور صاحب کہنے لگے وہ اس قدر قرآن و حدیث کے عالم و عامل تھے کہ انہیں استاذ الاساتذہ کہنا چاہیے، وہ دلیر اور بہادر تھے، اندجان کے رہنے والے تھے اور مرغان میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ کمیونسٹ اب ان کی دلیرانہ دینی سرگرمیوں سے واقف ہو چکے تھے چنانچہ ان ظالموں نے اس موحد عالم کو شہید کر دیا، اب انہیں کے ساتھی شیخ عبدالوہابی اندجان کے مدرسہ میں کتاب و سنت کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالغفور اور ان کے ساتھی اساتذہ نے ہمارے ساتھ بڑی محبت کا اظہار کیا، ضیافت کی اور آخر پر مجھے خنجروں کا تحفہ دیا اور پاکستان کے اہل توحید علماء کے ساتھ رابطوں اور ملاقاتوں پر زور دیا۔

مدرسے سے فارغ ہو کر میں حسب وعدہ ریلوے آفیسر کے گھر گیا کہ جس کے ہمراہ ہم نے آسٹراخان سے سفر کیا تھا، ہم اب اس کے گھر پہنچے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، روایتی شاندار ضیافت کرنے کے بعد اس نے کہا میں اپنے بیٹوں کو علماء بنانا چاہتا ہوں، میرا ایک بیٹا آپ پاکستان لے جائیں، وہاں دینی تعلیم دیں، میں نے اسے دین کے لیے وقف کر دیا ہے۔

نمنگان:

وادئ فرغانہ کے اس شہر میں اندجان کی نسبت دینی بیداری کچھ زیادہ ہی دیکھنے کو ملی، اس شہر کی مرکزی مسجد اور مدرسہ جو دو ایکڑ اراضی پر مشتمل ہوگا، کتاب و سنت کا مرکز ہے۔ میں جب ظہر کے وقت مسجد میں پہنچا تو اہل توحید کی یہ مسجد کہ جسے گنیز والی مسجد کہا جاتا ہے، وہاں ایک ہزار کے قریب نمازی تھے، نوجوانوں کے کورے اور چوڑے چپٹے چہروں پر سیاہ داڑھیاں دیکھ کر دل بڑا خوش ہوا اور جب عشاء کی نماز میں مسجد ”آمین“ کی آواز سے کونجی تو دل باغ باغ ہو گیا۔

نمنگان میں دعوت و تبلیغ:

جب میں نمنگان میں پہنچا تو تاشقند سے آئے ہوئے عرب امارات کے شیخ بڑا خوش ہوئے۔ جامعہ کے مہتمم اور مسجد کے خطیب شیخ عبدالاحد سے میرا تعارف کروایا گیا۔ اب ہم اکٹھے شیخ عبدالاحد کے گھر میں پہنچ گئے۔ آج کئی ایک پروگراموں میں ہمیں شامل ہونا تھا۔ نمنگان کے ایک تاجر نے دعوت کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ ہم وہاں پہنچے، کھانا کھایا اور پھر دین کی دعوت پیش کرنے لگے، سب لوگ ہمہ تن کوشش تھے۔

رات کو ایک شادی میں شامل ہوئے، دعوت و لبہ کے بعد دعوتی خطاب شروع ہو گئے، لوگ گھر کے وسیع و عریض صحن میں اس قدر کثرت سے آئے تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی، عورتوں کے لیے الگ بندوبست کیا گیا تھا۔

رات ہم نے شیخ عبدالاحد کے گھر میں گزاری، صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو درس کے لیے مجھے کہا گیا چنانچہ میں نے درس دیا اور شیخ عبدالاحد نے میری عربی تقریر کا ازبکستانی زبان میں ترجمہ کیا۔ شیخ عبدالاحد تقریباً ۳۵ سالہ نوجوان عالم دین ہیں، عربی زبان بڑی اچھی اور روانی سے بولتے ہیں۔ میں اگلے دن جب ان سے رخصت ہونے لگا تو وہ کہنے لگے رابطوں کو نہیں بھولنا، آپ کے اور ہمارے درمیان علماء کی آمد و رفت جاری رہنی چاہیے۔ اندجان

میں شیخ عبدالغفور صاحب نے بھی یہی بات کہی تھی اور اب شیخ عبدالاحد بھی یہی بات کہہ رہے تھے کہ ستر سالہ آہنی پردوں کے خاتمے کے بعد اب مسلمانوں، خاص طور پر علماء کا یہاں آنا اور دینی معاملات میں ہماری راہنمائی کرنا بہت ضروری ہے۔

اندجان سے نمزگان جاتے ہوئے راستے میں اور نمزگان شہر میں کئی جگہ عربی رسم الخط میں بورڈ ملاحظہ کیے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو روسی رسم الخط سے کس قدر نفرت اور عربی رسم الخط سے کس قدر محبت ہے۔ اسی طرح عربی کے ساتھ ان لوگوں کی محبت کی دوسری بڑی دلیل یہ ہے کہ یہاں مدارس کے طلباء اور دوسرے عام لوگوں میں بھی عربی بولنے والے آپ کو مل جائیں گے جبکہ انگریزی بولنے والا بڑی مشکل سے ہی کوئی ملے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی زبان عربی ہونی چاہیے، انگریز جہاں گئے انھوں نے وہاں انگریزی کو ٹھونسنا، روسی جہاں گئے انھوں نے زبردستی ہر ایک کو روسی زبان کی تعلیم دی۔ مگر مسلمانوں کے ملک ہیں اور خود ہمارا پاکستان کہ جس کی بنیاد ”لا الہ الا اللہ“ ہے اور آج کل وہ لسانی مصیبتوں کا شکار بھی ہے تو کیا ہی اچھا ہو اگر اس ملک کی سرکاری زبان عربی ہو جائے۔ اسی طرح ہمارا دین دار طبقہ اپنے بچوں کو عربی بولنا سکھائے۔ ہم سے تو مشرق بعید کا مسلمان بلکہ برہمنی ہزار درجہ بہتر ہے کہ جس نے حال ہی میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی ہے اور اس کے وزیر تعلیم نے اپنے ملک میں عربی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا ہے۔ عربی جبکہ ہمارے پیارے رسول کی زبان ہے۔ قرآن کی زبان ہے اور جنت میں بھی یہی زبان ہوگی تو ہمیں اس زبان کو محبت کے ساتھ سیکھنا اور اس پر فخر کرنا چاہیے۔

دوبارہ تاشقند میں:

کیم ستمبر کو تاشقند واپس پہنچا تو ازبکستان کے پہلے یوم آزادی کا دن منایا جا رہا تھا۔ تاشقند شہر میں جگہ جگہ رقص و سرود کی محفلیں پھا تھیں، وڈکا شراب اڑائی جا رہی تھی۔ ازبکستان کے صدر اسلام کریموف نے جہاں پیٹھ کر توپوں کی سلامی لی وہاں بھی ثقافتی طائفے ناچ رہے

تھے۔ کھیل کو جاری تھی۔ اس موقع پر صدر نے تقریر بھی کی۔ رات کو صدر کی تقریر اور جشن آزادی پر تبصرے کے لیے سرکاری مولوی نیلی ویشن پر براجمان ہوئے۔ ایک مولوی غلام نبی آکر کہنے لگا ہمارے صدر کا نام بھی اسلام ہے اور اسلام کریموف نے جب پہلے یوم آزادی پر پہلی تقریر کی تو آغاز بسم اللہ سے کیا اور یہ بسم اللہ ”مفتاح الجنۃ“ جنت کی چابی ہے۔ اسی طرح نائب مفتی ذاکر کہنے لگا اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے ”حب الوطن من الایمان“ وطن کی محبت ایمان سے ہے تو ہمارے صدر نے وطن کی محبت میں جو فقید المثال جشن منایا ہے یہ اسلام کا تقاضا ہے۔

قارئین کرام! یہ باتیں سن کر میں تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا، یا اللہ! یہ مفتی ہیں جو اللہ کے رسول ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کیے چلے جا رہے ہیں، جھوٹی باتوں کو حدیث کہہ رہے ہیں۔ اسلام کریموف جو کہ سابق کمیونسٹ سیکرٹری ہے اور اب روسیوں کے جانے کے بعد وہ صدر بن بیٹھا ہے محض اس کی خوشنودی کے لیے اور اپنی نوکری کو پکا کرنے کے لیے کس قدر احمقانہ باتیں کر رہے ہیں۔

یاد رہے! موجودہ حکومت جو کہ روسی کمیونسٹوں کی یادگار ہے، مسلمان ان سے اور ان کے سرکاری مولویوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ تاشقند کی ایک دعوت ولیمہ میں جہاں ایک ہزار کے قریب لوگ تھے، وہاں علماء کی تقریریں ہونے لگیں تو یہ سرکاری مولوی غلام نبی بھی وہاں موجود تھا، یقین جانیے! جب اس نے تقریر شروع کی تو میرے ارد گرد بیٹھے لوگوں نے انتہائی نفرت کا اظہار شروع کر دیا..... اور جب تاشقند کی ایک مرکزی مسجد کے خطیب عابد خان نے تقریر کی اور افغان جہاد کے لیے ایک دو جملے بولے تو نضال فرہنگی سے کونج اٹھی اور لوگ زار و قطار رونے لگے۔

اس کے بعد میں نے اس نوجوان خطیب کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھی، دوران خطبہ مجھے اتنی سی سمجھ آئی کہ وہ بدعات کے رو اور سنت کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں۔ بعد میں ان

سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی تو میری بات کی انہوں نے تصدیق کی۔ ان کی لائبریری صحاح ستہ، امام ابن تیمیہ، شیخ ابن باز اور شیخ عثیمین کی کتابوں سے آراستہ تھی، تاشقند شہر میں عابد خان جیسا اچھا خطیب کہیں نہیں ہے۔

اسی روز جمعہ کے دن میں اگلے وقت تاشقند کی مسجد ”طلا شیخ“ میں گیا، وہاں کے خطیب سے ملاقات کرنا چاہی تو پتا چلا وہ تو نکاح پڑھا رہے ہیں۔ نکاح کے بعد خطیب صاحب اپنے دفتر کے دروازے پر آئے اور مجھے اندر بلا لیا، میں بیٹھ گیا مگر نکاح کے لیے متواتر جوڑے آرہے تھے، خطیب صاحب نکاح پڑھا رہے تھے اور فیس وصول کر رہے تھے اور ہر ایک کی ویڈیو فلم بھی بن رہی تھی اور ظلم یہ تھا کہ دلہن تقریباً نیم عریاں لباس میں ہوتی تھی۔ میں نے اس پر خطیب صاحب کو سمجھایا اور انھیں بتلایا کہ دلہنوں کا اس طرح سے نیم عریاں لباس میں آپ کے پاس مسجد میں آنا ٹھیک نہیں ہے، دلہن کے ولی کا آنا ہی کافی ہے۔ اس پر مولوی صاحب کہنے لگے ہمارے ہاں دین نہ ہونے کی وجہ سے اسی طرح سلسلہ چلتا آ رہا ہے، بہر حال اب (ان شاء اللہ) میں اس کی اصلاح کروں گا۔ یہ سرکاری مولوی (داملہ) تھے۔

وطن واپسی اور تاشقند میں فوٹو سٹیٹ مشین کا نہ ملنا:

اب میرا واپسی کا پروگرام تھا چنانچہ ٹکٹ ”اوکے“ کروانے کے لیے ایئر پورٹ گیا تو پتا چلا کہ حزب اسلامی کے حکمت یار نے حکومت حاصل کرنے کے لیے کابل پر حملہ کر دیا ہے، اس لیے پی آئی اے کی پروازیں بند ہو چکی ہیں۔ لہذا مجھے بھی تاشقند میں بند ہونا پڑا۔ اب سوچا کہ چلو فون پر لاہور اطلاع کرنا ہوں اور اپنے سفر نامے کی پہلے قسط مجلۃ الدعوة کے لیے روانہ کرنا ہوں۔ چنانچہ میں نے فتح اللہ سے کہا کہ یہ چند کاغذ ہیں ان کی فوٹو سٹیٹ کروانی ہے۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا ہوتی ہے اور جب اس کی حقیقت اس کی سمجھ میں آئی تو پتا چلا کہ یہ مشین صرف حکومت کے خاص ادارے کے پاس ہوتی ہے، مارکیٹ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب مجبوراً انہی کاغذوں کو فیکس کے لیے دیا، یہ بھی سرکاری طریق

سے ہی ممکن ہے۔ بہر حال دو دن بعد پتہ چلا کہ آپ کی فیکس نہیں جاسکی، دو دن اور انتظار کریں۔ اسی طرح ٹیلیفون کرنے کے لیے بھی دو دن پہلے بنگ ضروری تھی۔ یہ صورت حال جو کہ روسی دور میں تھی ہنوز جاری ہے۔ جس طرح برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کا مطلب کیا ”لا الہ الا اللہ“ کا نعرہ بلند کر کے ملک تو حاصل کر لیا مگر وہ ملک انگریز نے ان ہاتھوں میں دیا جو ان کے نظام کے دلدادہ اور اس کی یونیورسٹیوں میں پڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ آج نصف صدی سے پاکستان ان دیسی جمہوری انگریزوں اور پاکستان میں اسلام کو غالب دیکھنے والوں کے درمیان کھینچا تانی کا باعث بنا ہوا ہے، جبکہ کنٹرول انگریزی کے وارثوں کا ہے۔ یہی صورت حال ان ریاستوں کو بھی درپیش ہے کہ افغان جہاد کی برکت سے یہ علاقے آزاد تو ہو گئے مگر روسیوں نے جاتے ہوئے کنٹرول انھیں کو دیا جو کمیونزم کے علمبردار تھے اور ماسکو کی یونیورسٹیوں کے پڑھے ہوئے ہیں اور اب تقریر کرتے ہوئے ”بسم اللہ پڑھ“ رہے ہیں..... بہر حال ان کے مابین کشمکش موجود ہے، تا جستان میں تو یہ کشمکش مسلح صورت حال اختیار کر گئی ہے جبکہ باقی ریاستیں جلد یا بدیر اس زد میں ہیں۔ اس لیے یہ علاقے مستقبل میں انقلاب کے کتنے مرحلوں سے گزریں گے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے جبکہ ان کے رونما ہونے میں دو آراء نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہ ایک فطری عمل ہے جسے روکا نہیں جاسکتا، مسلمان اس وقت اسلام کے حوالے سے اپنی پہچان کی فکر میں ہیں اور یہ کام وہاں جاری ہے اور اس مقصد کے لیے مسلمانوں اور علماء کی مدد اور راہ نمائی بھی انھیں درکار ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے کوشاں ہیں جبکہ حکومتیں ابھی سے خائف ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ وہ اسلام کو جو منظم الحادی حکومت کے بے پناہ مظالم کے باوجود ستر سال بعد بھی اسی طرح زندہ ہے جس طرح وہ ستر سال قبل زندہ تھا تو اب موجودہ حکومتیں جو شکست خوردہ روس اور اس کے الحادی نظریے کی باقیات ہیں ان سے اسلام بھلا کیوں کر دے گا۔ اسلام اب اللہ کے فضل سے ابھرے گا اور جہادی راستے سے ہی ابھرے گا۔

روس میں بغیر ویزے کے میرا گھومنا پھرنا اس بات کا شاہد ہے، افغانستان سے ہو کر روس میں جانا اس حقیقت کی صاف، کھلی اور روشن دلیل ہے۔ اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد میں ۱۲ ستمبر کو بارہ بجے کے قریب ازبکستان ایئر لائن کے جمبو جہاز پر بیٹھ چکا تھا، عصر کے قریب کراچی ایئر پورٹ پر اترا اور ساڑھے چھ بجے لاہور شہر میں تھا۔

اب میں اپنے اس ملک پاکستان میں تھا کہ جو روس کے خلاف افغان بھائیوں کے قدموں کے ساتھ قدم اور کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا ہو گیا، اس جہادی صف بندی میں سعودیہ بھی شامل تھا۔ بڑی دیر بعد یہ پہلا موقع تھا کہ افغانستان کے مسئلہ کا حل جہاد کے راستے سے تلاش کیا گیا۔ اب چونکہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کا راستہ ہے، اللہ کا پسندیدہ راستہ ہے چنانچہ اس راستے سے اللہ نے افغانستان میں اس امت کو روسی ریچھ کے دانتوں سے نکال کر واپس ہی نہیں لوٹایا بلکہ وسط ایشیا کے پانچ ملک بھی اللہ نے ”جھونگے“ میں مسلمانوں کی جھولی میں ڈال دیے۔ پاکستان کو اب پھر ایک جنرل اختر عبدالرحمن کی ضرورت ہے، انڈیا کے خلاف سینہ سپر ہونے کی ضرورت ہے، روس توڑنے کے بعد اب انڈیا توڑنے کی ضرورت ہے، یہ بھی ٹوٹے گا تو جہاد کی برکت سے ٹوٹے گا اور اس کے ٹوٹنے کے بعد جھونگے میں کیا کچھ اسلامیان پاکستان کی جھولی میں گرنے والا ہے، اسے اللہ ہی جانتا ہے۔ لگتا ہے فرشتے ہاتھوں میں تختے تھامے کھڑے ہیں کہ کب ہم اس راستے پر چلیں اور کب تحائف کے وارث بنیں۔

یقیناً ان تحائف کے ہم حقدار بن سکتے ہیں اگر ہم پوری قوم کو مجاہد قوم بنا ڈالیں۔ روسی کفار جو دنیا پر چھا گئے، تو اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنی قوم کے ہر فرد کو لڑاکا بنا دیا، روسی حکمرانوں نے ہر نوجوان کے لیے دو سال کی فوجی ٹریننگ لازمی قرار دے رکھی ہے یعنی باقائدہ تنخواہ دار فوج کے علاوہ پوری قوم کے ہر نوجوان کو بے قائدہ سپاہی بنا دیا۔

آہ! یہ تو وہ وصف ہے جس سے مسلمان متصف تھے اور اسی وصف سے تو پوری دنیا پر

چھا گئے تھے۔ مگر آج وہ اس سے تہی دامن ہیں اور ان کا یہ وصف کفار اپنا چکے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو چھوڑتے ہوئے حکم دیتے ہیں:

” (مسلمانو!) مشرکوں سے سب اکٹھے ہو کر لڑو جیسا کہ وہ تم سے اکٹھے ہو کر لڑتے ہیں۔“ (التوبة: ۳۶)

غور کیجیے! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ہر فرد کو مجاہد دیکھنا چاہتا ہے اور جو مجاہد بننا نہیں چاہتا تو اللہ کے رسول ﷺ اس کے لیے یہ وعید سناتے دکھائی دیتے ہیں:

”جس نے نہ جہاد اور نہ ہی اس کے دل میں جہاد کا خیال پیدا ہوا وہ مر گیا تو منافقت کے (مختلف شعبوں میں سے) ایک شعبے پر مر گیا۔“ (مسلم)

امت مسلمہ کے ہر فرد کے ذہن میں یہ حقیقت نقش ہو جانی چاہیے کہ یہ وہ امت ہے کہ جس کے ہاں نماز جیسی عبادت بھی اپنے جلو میں جہاد کا جلال لیے ہوتی ہے۔ ”صحیح بخاری، کتاب العیدین“ میں ذرا ملاحظہ کیجیے آخری جہادی امت کے آخری رسول امام الجہادین ﷺ کی نماز عید:

”اللہ کے رسول ﷺ صبح کے وقت جائے نماز کی طرف چلتے تو آپ کے آگے آگے نیزہ اٹھایا ہوا ہوتا پھر وہ جائے نماز کے قریب آپ کے سامنے گاڑ دیا جاتا، آپ ﷺ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔“

قارئین کرام! عید کے پر مسرت موقع پر مسلمان کھیل بھی کھیلتے تو وہ جہادی کھیل ہوتے، اللہ کے رسول ﷺ دیکھتے اور خوش ہوتے، نشانہ بازی تو اللہ کے رسول ﷺ کو بہت پسند تھی۔ چنانچہ فرمایا:

”جس نے نشانہ بازی کو سیکھا پھر اسے چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

قارئین کرام! اب ذرا موازنہ کیجیے روس اور افغانستان کے درمیان اور پھر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے جہادی فرامین کی صداقت دیکھیے جہادی میدانوں میں..... کہ روس نے



اپنی قوم کے ہر فرد کو فوجی بنایا، وہ سپر پاور تھا، وہ افغانستان میں آیا، ایک ایسی قوم پر حملہ آور ہوا کہ جس کا ہر فرد انسانی ثقافت کے مطابق مسلمہ سے محبت کرنے والا، نشانہ باز تھا۔ چنانچہ دونوں کا مقابلہ ہوا اور روس کو افغانیوں کے بچے بچے سے واسطہ پڑا اور یہی وہ حقیقت ہے، یہی وہ اسلامی ثقافت ہے کہ جس نے روس کا جنازہ نکال دیا اور یہی مسلمانوں کی وہ تہذیب اور تمدن ہے کہ جس سے وابستہ ہو کر وہ ہندوؤں اور صلیبیوں کے طاغوتی اور ظالمانہ چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مسند احمد میں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان بالکل واضح ہے، جس کے مطابق اگر مسلمان جہاد ترک کر دیں گے تو وہ مصیبتوں میں گرفتار ہو جائیں گے اور یہ مصائب اس وقت تک ختم نہ ہوں گے جب تک وہ جہاد کی جانب پلٹ نہیں آتے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ افغانستان میں جہاد کی جانب جس قدر پلٹے اسی قدر ان کے مصائب چھٹ گئے اور اب اس امت کے نام اس کے رب اور رسول ﷺ کا یہی پیغام ہے کہ جس قدر تم جہاد میں آگے بڑھتے جاؤ گے مصائب کو اپنے قدموں تلے کچلتے چلو جاؤ گے، افغانستان کے بعد روس کے در و دیوار پر میں نے یہی کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے، کسی دوسرے کو یہ لکھا ہوا دکھائی دیا کہ نہیں مگر مجھے تو بہر حال یہی لکھا ہوا دکھائی دیا ہے اور میں نے اسے اللہ کی توفیق سے لکھ دیا ہے امت مسلمہ کے ہر اس فرد کے نام جو اسلام کو سب دینوں پر غالب دیکھنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے ہتھیار کو اپنا زیور بنانا چاہتا ہے۔

